بار اوّل ۳۳۰۰

قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم
بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً (رواہ البخاری)

سلسلہ نمبر 57

ماخوذ
مواعظ حکیم الامت (محشّٰی)
جلد ۳

وعظ

جلاء القلوب معروف بہ جامِ جمشید

از افادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ

حواشی

مولانا خلیل احمد تھانوی

شعبہ نشر و اشاعت جامعہ دار العلوم الاسلامیہ
کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور نمبر ۱۸
فون پرانی انارکلی: ۷۳۵۳۷۲۸ کامران بلاک: ۴۴۸۰۶۰ ۵۴۲۲۲۱۳

جنوری ۱۹۹۹ء

رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

مواعظ حکیم الامت (جدید)

جلد سوم

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ

عنوانات وحواشی

مولانا خلیل احمد تھانوی

شعبۂ نشر واشاعت

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ

کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

مواعظ حکیم الامت (محشّٰی)

جلد سوم

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی

مولانا خلیل احمد تھانوی

شعبہ نشر و اشاعت

جامعہ دار العلوم الاسلامیہ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: ۴۴۸۰۶۰ - ۵۲۲۲۲۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی ب

جلاء القلوب معروف بہ جام جمشید

این	متٰی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	تعداد سامعین	متفرقات
باغپت ضلع میرٹھ، کوٹھی نواب جمشید علی خان صاحب	۲ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ بروز یک شنبہ ۶ فروری ۱۹۱۶ء	شروع ۸ بجکر ۲۸ منٹ وقت صبح ختم ۱۲ بجے کل وقت ۳ گھنٹہ ۳۲ منٹ	کھڑے ہوکر	انتفاع بالقرآن کے لئے قابلیت قلب ضروری ہے	احقر محمد مصطفٰے میرٹھی	تخمینا ۲۰۰ - اور بالاخانہ پر مستورات	مجمع میں ایک عیسائی بھی تھا اس نے بعد وعظ کہا کہ ایسے مولوی اور ایسا لیکچر ہونا چاہیئے۔

دعاء خطبہ - امّا بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَ ھُوَ شَھِیْدٌ ۔

یہ آیت سورۂ قاف کی ہے۔ اس میں اللہ تعالٰی نے قرآن مجید سے یعنی دین[ع] سے منتفع[له] ہونے کی ایک شرط ارشاد فرمائی ہے۔ اور یہ بڑی رحمت ہے حق تعالٰی کی کہ اول تو بندوں کے نفع کے لئے ایک بے مثل کتاب نازل فرمائی، جس سے زیادہ کوئی کتاب نافع نہیں ہو سکتی۔ دوسرے صرف کتاب کے اتار دینے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس سے انتفاع کا طریقہ

ع قرآن کو دین کہنے کی وجہ آگے آتی ہے ۱۲ له نفع اٹھانا۔

اور شرط بھی بیان فرمادی، یہ بے حد شفقت ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی بڑے کو چھوٹے سے جو تعلق ہوتا ہے وہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک ضابطہ کا، دوسرے شفقت کا۔ اور دونوں کے آثار الگ الگ ہوتے ہیں۔ ضابطہ کا تعلق تو یہ ہے جیسے حاکم کو رعایا کے ساتھ ہوتا ہے کہ ایک حکم دیا، اور اس کا اعلان کر دیا بے فکر ہو گئے۔ اب اگر کوئی اس حکم کو نہ مانے گا تو حاکم کی بلا سے اس کے ساتھ ضابطہ کی کارروائی کی جائے گی اور جیل خانہ بھیج دیا جائے گا۔ شفقت کا تعلق یہ ہے جیسے باپ کو بیٹے کے ساتھ ہوتا ہے کہ کوئی بات اس کو بتاتا ہے تو صرف ایک دفعہ بتانے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اس کو بار بار سمجھاتا ہے۔ ایک دفعہ یہ کہہ کر نہیں چھوڑ دیتا کہ اس کے خلاف کرو گے تو سزا پاؤ گے، جیسے حاکم کرتا تھا۔ بلکہ یہاں دو قسم کے تفاوت ہیں، ایک تو یہی کہ ایک دفعہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے ایک ہی مضمون کو پچاس پچاس دفعہ کہتا ہے، ایک ہی لفظ سے یا عنوان بدل بدل کر۔ دوسرے اگر اس پر عمل کرانے کے لئے کسی اہتمام کی یا تدبیرِ خاص کی ضرورت ہوتی ہے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

مثلاً! حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ جو کوئی چوری کرے گا اس کو سزا ہوگی، حاکم تو اس ایک اعلان ہی پر اکتفا کرے گا اور کہہ دے گا کہ ہمارا فرض ادا ہو گیا۔ اور باپ اسی لفظ کو بیٹوں سے دو دفعہ، چار دفعہ، دس دفعہ کہے گا اور سمجھائے گا، اور کسی تعداد پر بھی کفایت نہ کرے گا۔ بلکہ جب تک اس کو کسی قسم کا اندیشہ اور خدشہ بھی رہے گا کہ یہ چوری کریں گے اس وقت تک برابر سمجھاتا رہے گا اور اگر یہ معلوم ہو گا کہ یہ چوری کے عادی ہیں، تو اس سے بچانے کے لئے خاص اہتمام اور تدبیر کرے گا۔ مثلاً اول چوری کے اسباب کی تشخیص کرے گا، کہ ان کو یہ عادت کیوں پڑی؟ اگر اس عادت کا سبب حبِ مال ثابت ہو گا تو اس کا علاج کرے گا۔

مثلاً ان کو سمجھائے گا کہ مال اچھی چیز نہیں، کیونکہ زیادہ تر مال کھانے پینے کے لئے اور

زبان کی لذت کے لئے کھایا جاتا ہے، مگر زبان کی لذت کیا چیز ہے؟ ذرا دیر کے لئے مزہ لے لیا اور اس پر جو کلفت مرتب ہوتی ہے وہ ذرا دیر کی نہیں بلکہ ممتد ہے، مثلاً چھ مہینے کی سزا ہے۔ تو کیا یہ عقل کی بات ہے کہ ایک لمحہ کے مزے کے لئے چھ مہینے کی کلفت[1] کی پرواہ نہ کی جائے۔ اسی طرح قسم قسم کی تدبیروں سے حبِ مال کو چھوڑائے گا تاکہ بچے چوری نہ کریں۔

دوسری مثال سنیئے! آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض دفعہ کوئی موسم خراب ہوتا ہے، اور اس میں بعض چیزوں کا کھانا مضر ہوتا ہے، جیسے امرود، کھیرا وغیرہ تو حاکم تو بڑی سے بڑی شفقت یہ کرتا ہے کہ اعلان کرا دیتا ہے، کہ آجکل موسم خراب ہے فلاں فلاں چیز مت کھانا۔ اور ماں باپ بچے کے لئے صرف یہ نہیں کرتے کہ ان چیزوں کا نقصان بتا دیں، اور ایک دفعہ کہہ کر چھوڑ دیں۔ بلکہ طرح طرح کی تدبیروں سے ان کو روکتے ہیں، ان کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے، اور پیسہ ہاتھ میں نہیں دیتے۔ اگر کسی طرح کوئی پھل گھر میں آبھی گیا تو اس پر کوئی بدمزہ چیز لگا دیتے ہیں، جیسے ایلوا، یا مرچ وغیرہ تاکہ بچے کو اس سے طبعی نفرت ہوجائے۔ بلکہ اس کی نگرانی رکھتے ہیں کہ وہ چیز گھر میں آنے ہی نہ پائے، بچہ ہاتھ میں ہی نہ لے اور اس کی صورت ہی نہ دیکھے، یہاں تک کہ خود بھی اس کا کھانا چھوڑ دیتے ہیں، چاہے خود کو نقصان نہ کرتی ہو۔ اس طرح کی سینکڑوں مثالیں ہیں۔ جن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ضابطہ کے معاملہ میں، اور شفقت کے معاملہ میں بڑا فرق ہے۔

اب سمجھو کہ خدا تعالیٰ کو بندوں کے ساتھ شفقت کا تعلق ہے، صرف ضابطہ کا تعلق نہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ سے بندوں کو تعلق نہ بھی ہو تب بھی یہ نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ کو بندوں سے تعلق نہ رہے۔ اس کی موٹی مثال وہ ہی ماں باپ کی شفقت اولاد کے ساتھ ہے۔ کہ آپ دیکھتے ہیں کہ اولاد کیسی ہی نالائق ہو، اور ماں باپ سے قطع تعلق بھی کرے لیکن ماں باپ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ان سے تعلق نہ رکھیں۔ یہ شفقت ماں، باپ میں کہاں

---

[1] کلفت: تکلیف

سے آئی ہے؟ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ کہ ان کی یہ شفقت ایک ذرا سا عکس اور پرتو ہے حق تعالیٰ کی شفقت کا۔ اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب عکس کی یہ حالت ہے، تو اصل کی شان کیا کچھ ہوگی؟ جب ماں باپ اتنے شفیق ہیں، تو حق تعالیٰ کتنے شفیق ہوں گے؟

چہ باشد آن نگار خود کہ بندد ایں نگارہا

دیکھئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ (الزخرف) "یعنی کیا ہم تم کو سمجھانا چھوڑ دیں اس وجہ سے کہ تم راہ پر نہیں آتے" کیا انتہا ہے شفقت کی اس شفقت کو پیشِ نظر رکھ کر قرآن کو دیکھئے تو اسلوب قرآن یہ ملے گا، کہ جہاں کوئی امر فرمایا ہے وہاں اس پر عمل کرنے کے طریقے بھی بتائے ہیں۔ یہ اسلوب قرآن کا "طالب" کو وجد میں لے آتا ہے۔ اسی اسلوب کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ بعض اوامر کو بار بار مکرر کیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا میں نے ابھی مثال دی کہ باپ اولاد کو کسی بات کی ایک دفعہ تعلیم کر کے نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ بار بار کہتا ہے اور مختلف عنوانوں سے سمجھاتا ہے۔ کیونکہ اس کو ضابطہ کا معاملہ نہیں کرنا ہے، بلکہ شفقت کا معاملہ کرنا ہے۔ ایک دفعہ کہہ کر اس کا دل نہیں مانتا، وہ اس بات کو اولاد کے دل کے اندر اتارنا چاہتا ہے۔ یہی حالت ہے اسلوبِ قرآنی کی کہ بہت سے اوامر کو طرح طرح کے عنوانوں سے اور بار بار ارشاد فرمایا ہے۔ یہ انتہا درجہ کی شفقت ہے۔ مگر اس کی قدر وہ کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو بندہ اور خدا کو خدا جانتا ہو "خدا" وہ ہے جو کسی کا کسی طرح محتاج نہیں۔ اور "بندہ" وہ ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں سراپا احتیاج ہے، اگر خدا تعالیٰ بندہ کے ساتھ بالکل استغناء کا برتاؤ بھی کریں تب بھی ان کے شایانِ شان ہے۔ کیونکہ وہ غنی ہیں، مگر ایسا نہیں کیا۔ اوّل تو تکلیف مالایطاق نہیں دی، دوسرے اوامر کے ساتھ سہولت کے طریقے بھی بتا دیئے اور ایک دفعہ کہہ کر نہیں چھوڑ دیا، بلکہ بار بار اوامر کو دوہرایا۔

اس سے حیرت ہوتی ہے ایک مصنف کی حالت پر، اس نے ایک کتاب لکھی ہے

جس میں قرآن کے مکررات پر اعتراض کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ کسی مصنف کے لئے کتاب میں ایک بات کو دوہرانا عیب میں داخل ہے۔

افسوس ہے! اس کی وہ ہی مثل ہے کہ گدھے کو دیا نمک اس نے کہا میری آنکھیں پھوڑ دیں۔ بیوقوف نے یہ قدر کی شفقت کی۔ یہ شخص شاید باپ نہیں بنا کسی بیٹے کا، کہ اس کو معلوم ہوتا کہ بیٹے کے سامنے کسی بات کو دوہرانا عیب میں داخل ہے، یا شفقت میں۔ اگر یہ باپ نہ بنا تھا تو دوسروں کو دیکھ کر قیاس تو کر سکتا تھا، کہ بیٹے کو ایک ہی دفعہ نصیحت کیا کرتے ہیں یا دو چار، دس پانچ، سو پچاس دفعہ۔ اگر باپ پر بھی بیٹا یہی اعتراض کرے، کہ مجھ سے ایک بات کو بار بار کیوں کہتے ہو؟ تو اس وقت باپ کو کوئی بُرا کہے گا یا بیٹے کو؟ سمجھ لیجئے! کہ حق تعالیٰ کے کلام میں تکرار ہونا عیب نہیں، بلکہ اس مصنف کی "سمجھ" میں عیب ہے۔ اور قرآن میں تکرار عین شفقت ہے۔ اسی واسطے خود فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا (القرآن) یعنی ہم نے قرآن میں طرح طرح سے بیان کیا ہے تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں تاکہ وہ سمجھیں" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو ضابطہ کا برتاؤ نہیں کرنا ہے، بلکہ دل میں اتار دینا منظور ہے۔ غرض میں نے کہا تھا کہ منفعت کے دو اثر ہونگے، ایک تو یہ اثر ہوگا کہ ایک بات کو بار بار کہا جائے گا، دوسرا اثر یہ ہوگا اس پر عمل کرنے کیلئے دستور العمل بھی تیار ہوں گے۔ دیکھئے! ایک تو یہ صورت ہے کہ بچہ کے ہاتھ میں قلم دے دیا اور کہہ دیا کہ لکھو۔ اور ایک یہ ہے کہ قلم ہاتھ میں دے کر طریقۂ تحریر بھی بتایا جائے، اور ایک ایک حرف اپنے سامنے اس کے ہاتھ سے بنوا کر ہاتھ پکا کرایا جائے۔ شفیق استاد کا یہی کام ہے۔ صرف قلم بچہ کے ہاتھ میں دے دینا دل خوش کرنے کی ترکیب ہے، اور بس جیسے بعض وقت اسکولوں میں انعام میں صرف قلم دے دیا جاتا ہے۔ گو اس سے بھی مقصود یہی ہوتا ہے کہ انعام ایسا دیا جائے جو تعلیم سے اور لکھنے پڑھنے سے تناسب رکھتا ہو۔ قلم ایسی ہی چیز ہے کہ طالب علم کے لکھنے کے کام میں آئے گا، اور اس سے اس کو علم کا شوق بڑھے گا۔ تو اس معنی کر یہ بھی شفقت ہے۔ لیکن یہ شفقت ناتمام ہے۔

جس کو دل خوش کرنا ہی کہہ سکتی ہیں۔ شفقت کامل وہ ہی ہے، کہ قلم ہاتھ میں دے کر، سامنے بٹھا بٹھا کر لکھنا سکھایا جائے۔ یہ شفقت ضابطہ والوں کے یہاں نہیں ہو سکتی۔ دیکھئے اگر ایک افسر کسی محرر کو کچھ لکھنے کا حکم دیتا ہے، تو بحیثیت افسر طریقۂ تحریر بتلانا اس کے ذمہ نہیں، اس کو ضابطہ کا تعلق کہتے ہیں۔ اور شفیق استاد طریقۂ تحریر بھی بتلاتا ہے، اس کو شفقت کا تعلق کہتے ہیں۔

نفع شفقت ہی کے تعلق سے ہوتا ہے۔ ضابطہ کے تعلق سے نہیں ہوتا۔ دیکھئے! کسی کو بائیسکل دے دیجئے، اور اس کو نہ طریقہ اس پر سواری کا بتلایئے تو اس سے اس کو کچھ نفع نہیں پہنچ سکتا، بلکہ بجائے اس کو نفع پہنچنے کے اس پر وہ سواری کرتا، وہ بائیسکل اس کے سر پر لد جائے گی۔ اور جو دینے والا شفیق ہوگا۔ مثلاً باپ بیٹے کو سائیکل دے تو سواری کی تعلیم بھی کرے گا، یہ شفقت کا برتاؤ عام تعلقات میں نہیں ہوتا۔ بلکہ خاص تعلقات میں ہوتا ہے، حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ خاص تعلق ہے، اس وجہ سے ایسا برتاؤ کیا اس خاص تعلق کے ساتھ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک چیز مفید ہم کو دیں اور اس کا طریقۂ استعمال نہ بتادیں۔

چنانچہ اس آیت میں اُس طریقہ ہی کا بیان ہے۔ اس سے پہلی آیت میں کچھ امتوں کے ہلاک کرنے کی خبر دی، پھر اس قصہ سے انتفاع کا طریقہ بھی خود ہی بتلادیا حالانکہ اہلِ عقل سمجھ سکتے ہیں کہ قصہ سنانے سے مقصود داستان گوئی نہیں ہوتی (خصوصاً قرآن جیسی مذہبی کتاب میں) بلکہ مقصود ان واقعات سے عبرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ بنا بریں کوئی ضرورت "طریقۂ انتفاع" کے تعلیم کی نہ تھی۔ مگر غایت شفقت کی وجہ سے طریقہ کو بھی خود ہی بیان فرما دیا، اس واسطے کہ ایسی سلیم طبیعتیں کم ہیں جو قصوں سے پورا نفع اٹھا سکیں۔ غباوت[1] اور کجی طبیعتوں میں غالب ہے۔ اگر صرف قصوں کے بیان پر اکتفا کیا جاتا تو پورا نفع نہ ہوتا، بلکہ کج فہم طبیعتیں شاید یہ کہتیں کہ مذہبی کتاب میں قصوں کا کیا کام؟ چنانچہ آجکل بہت طبیعتیں ایسی ہیں جن میں یہ

---

[1] کند ذہنی۔

کی موجود ہے۔ اور ایسے لوگ یہی اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن سلیم طبیعتیں بھی موجود ہیں جو قصوں سے نفع اٹھاتی ہیں لیکن ایسا نفع وہ بھی نہیں اٹھا سکتی تھیں جیساکہ اب طریقۂ انتفاع کے بیان کے بعد اٹھا سکتی ہیں۔ چنانچہ آگے معلوم ہوگا یہ طریقۂ ابلغ ہے نفع میں۔

اس کا فرق دوسرے طریقہ سے یعنی صرف قصہ سنا دینے میں، اور طریقہ انتفاع بتلانے میں جو فرق ہے اس کو آجکل کے مذاق کے موافق اس طرح آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایک طریقہ قصہ گوئی کا پرانا تھا جس میں بہت دلچسپ حکایتیں بیان کی جاتی تھیں اور ایک طریقہ آجکل ہے جس کو ناول کہتے ہیں، اس میں اور اس میں فرق یہی ہے کہ پہلے طریق میں صرف حکایتیں بیان کی جاتی تھیں، اور اس نئے طریقے میں صرف حکایتیں نہیں ہوتیں بلکہ حکایتوں کو اس پیرایہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ جس سے ان کاموں کا جو حکایتوں میں درج ہیں طریقہ بھی معلوم ہوتا ہے، اسی واسطے یہ طریقہ زیادہ موثر ہے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ناولوں کی تعریف کرتا ہوں، یا دیکھنے کی اجازت دیتا ہوں، بلکہ صرف اثر دکھلانا مقصود ہے۔ ورنہ ناولوں کو دیکھنا نہایت مضر ہے۔ جس کا مازیہ ہے کہ اس کے مصنف اکثر وہ لوگ ہیں جن میں دین نہیں، اور جن کے اخلاق خراب ہیں، مصنف کے اخلاق اور اس کی قلبی حالت کا اثر کلام میں ضرور ہوتا ہے اور خصوصاً جبکہ اس میں مضامین بھی زیادہ تر مفسدِ اخلاق ہی ہوتے ہیں، اور اس کے ساتھ پیرایہ کلام کا بھی ایسا ہوتا ہے جو موثر ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس سے فسادِ اخلاق، اور بے دینی ہی کا اثر زیادہ ہوگا۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ پرانی کتابیں قصوں کی جیسے بہارِ دانش وغیرہ کس قدر فحش ہیں، لیکن ان کے پڑھنے سے نہ اس قدر بے دینی پیدا ہوتی ہے، نہ فسادِ اخلاق جتنا کہ ناولوں سے ہوتا ہے۔ غرض ناول بہ نسبت پرانے قصوں کے زیادہ موثر ہیں اس وجہ سے کہ ان میں طریقۂ عمل بھی بتلایا جاتا ہے۔

یہاں ایک مضمون اور ذہن میں آگیا وہ یہ ہے کہ مولانا روم کی مثنوی میں بھی بہت سے فحش قصے ہیں، ایسے کہ اگر یہ کتاب مولانا رومؒ کی نہ ہوتی تو ہم تو اس کو ہاتھ بھی نہ لگاتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مولاناؒ نے جہاں کہیں ایسے قصے لکھے ہیں، وہاں بغیر ان کے کام نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ تو اب اس کی مثال ایسی ہوگئی جیسے ناج کی کاشت، کہ ناج کیسی پاکیزہ چیز ہے لیکن اس کی کاشت میں میلے کا کھاد دینا پڑتا ہے اگر اس پر ناج کی پیداوار موقوف نہ ہوتی تو اس کا ڈالنا لطیف طبیعتیں کبھی گوارا نہ کرتیں یہ لوگ چونکہ اہل تحقیق، اور عارف ہیں یہ فحش سے بھی وہ پاکیزہ نتیجے نکالتے ہیں کہ دوسرا کوئی نہیں نکال سکتا، ان کے فحش کلام سے بھی انوار پیدا ہوتے ہیں۔

اور جن کے دلوں میں گندگی بھری ہوئی ہے، اور دین اور عرفان سے ان کو مس نہیں، ان کے پاکیزہ کلام سے بھی گندگی اور ظلمات ہی پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا نا دلوں کو مثنوی پر قیاس نہیں کر سکتے۔ دیکھئے! ایک ہی بات ہوتی ہے کہ کسی کے کلام میں کچھ اثر رکھتی ہے، اور کسی کے کلام میں کچھ۔ اگر کوئی کسی کافر کا نام لے تو زبان خراب کرنا کہا جائے گا، لیکن قرآن میں بعض کفار کا نام آیا ہے جیسے فرعون، قارون، ہامان، وغیرہ تلاوت میں جب ان کا نام آتا ہے تو بجائے زبان خراب ہونے کے فی حرف دس نیکیاں ملتی ہیں جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔ عجیب بات ہے کہ اسی لفظ سے ایک جگہ زبان خراب ہوتی ہے، اور ایک جگہ نیکیاں ملتی ہیں۔ قرآن میں فرعون کا لفظ زبان سے کہا اور پچاس نیکیاں مل گئیں۔ یہ بات لفظ "فرعون" اسی وجہ سے تو پیدا ہوگئی کہ حق تعالیٰ کے کلام میں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی لفظ ایک متکلم کی وجہ سے ایک اثر رکھتا ہے، اور دوسرے متکلم کی وجہ سے دوسرا اثر رکھتا ہے۔ بس میرا مدعا ثابت ہوگیا کہ نادانوں کو مثنوی پر نہیں قیاس کر سکتے۔

اب میں ایک بات اور کہتا ہوں! کہ اس وقت اس فرعون والی مثال کو ذکر نہ کرنا چاہیئے

تھا کیونکہ "سرود بستان یاد دہانیدن" ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں کو وحشت ہو گی، اور طرح طرح کے سوالات پیدا کریں گے۔ آجکل طبیعتوں میں کجی زیادہ ہے، ذرا سی بات منہ سے نکالتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

اسی واسطے میں اہل علم کو مشورہ دیا کرتا ہوں، کہ پیچیدہ اور دقیق باتیں نہ بیان کیا کریں، اور بے ضرورت ایسے مضامین سے بچا کریں کیونکہ آجکل ذرا سی بات میں فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے، اور پھر اس پر مباحثے، مناظرے، اور رسالہ بازی، شروع ہو جاتی ہے۔

اس وقت فرعون والی مثال زبان پر نہ آتی تو اچھا تھا، نہ معلوم کیا کیا سوال اس پر پیدا ہوں، لیکن کیا کیا جائے ایسے سوال پیدا ہو چکے ہیں۔ یہ سوال "لفظ فرعون" کا دہلی سے میرے پاس آچکا ہے لکھا تھا کہ کیا فرعون جیسا گندہ نام پڑھنے سے بھی نیکیاں ملیں گی؟ دیکھئے کس قدر طبیعت کی کجی ہے، یہ سوال اس وقت سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا حالانکہ کم فہم، بلکہ مخالفین ومعاندین بھی ہر زمانہ میں رہے ہیں، مگر یہ سوال کسی کے ذہن میں نہیں آیا۔

میں نے جواب میں لکھا کہ "حیثیات مختلف ہونے سے احکام مختلف ہو جاتے ہیں اور آثار مختلفہ مترتب ہوتے ہیں۔ لفظِ فرعون پر اس حیثیت سے کہ حق تعالیٰ کے کلام میں آیا ہے نیکیاں ملتی ہیں، ویسے یہ ایسا منحوس نام ہے کہ زبان پر لانا بھی باعث نحوست ہے" یہ چند باتیں کام کی درمیان میں آگئیں۔

ذکر یہ تھا کہ طریق عمل کی تعلیم کو بھی کلام کے موثر ہونے میں بڑا دخل ہے۔ اگر طبیعت سلیم ہو تو اثر جلدی ہوتا ہے، اور قوی ہوتا ہے۔ اور سلیم نہ ہو تو اثر کم ہوتا ہے، اور دیر میں ہوتا ہے۔ لیکن ہر صورت میں اگر طریقہ بلیغ ہو تو اثر ضرور ہوتا ہے، اور متکلم کی شفقت پر ضرور دلالت کرتا ہے۔ مگر طبائع کی حالت آجکل یہ ہے کہ بلیغ طریقہ پر بھی اعتراض

کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کے مکررات پر اعتراض کیا ہی گیا ہے۔ پہلے کسی وقت میں تو طبائع کی یہ حالت تھی جس کو شیخ سعدیؒ نے بیان کیا ہے ؎

نگویند از سر بازیچہ حرفے کزان پندے نگیرد صاحب ہوش

سلیم طبائع کھیل کی باتوں میں سے اور نکمی باتوں میں سے بھی کام کی باتیں نکال لیتی تھیں۔ اور اب حالت یہ ہے جس کو دوسرے شعر میں بیان کیا ہے ؎

اگر صد باب حکمت پیش نادان بخوانی آیدش بازیچہ در گوش

کہ کام کی باتوں میں سے بھی نکمی باتیں نکال لے جاتی ہیں، اور اچھی سے اچھی بات پر بھی اعتراض کر دیا جاتا ہے۔ آجکل زیادہ مذاق غیر سلیم ہی ہیں، جن سے یہ امید کم ہے کہ صرف قصہ کو سن کر نتیجہ نکال لیں گے۔ لہٰذا مقتضائے شفقت یہی تھا کہ قصوں کو بیان کر کے نتیجہ کو بھی بیان کیا جائے، اور طریقہ ان سے فائدہ اٹھانے کا بھی بیان کیا جائے۔

دیکھئے! طبائع کی یہ حالت ہے کہ علماء وعظوں میں قرآن وحدیث کے مضامین بہت شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اور مالہ وما علیہ سب سے بحث کرتے ہیں، لیکن سننے والے صرف لہجہ اور خوش آوازی سننے کو آتے ہیں اور اسی کو معیار (وعظ کے اچھے اور برے ہونے کا) بنا رکھا ہے۔ بات یہی ہے کہ طبائع لہو ولعب کی طرف زیادہ راغب ہیں، جس چیز میں مزہ آتا ہے اسی کی طرف مائل ہوتی ہیں، چاہے اس میں کام کی بات ایک بھی نہ ہو۔ اور جس چیز میں مزہ نہ آوے، اس کی طرف مطلق التفات نہیں ہوتا، چاہے اس میں ہر ہر لفظ کام کا ہو۔

مجھے الہ آباد میں بیان کرنے کا اتفاق ہوا تو بعد وعظ کے بعض لوگوں نے کہا کہ وعظ میں اتنی کسر ہے کہ خوش آوازی نہیں، میں نے کہا ہاں بھائی ٹھیک کہتے ہو! میں گویا نہیں ہوں، اور نہ میرے خاندان میں کوئی گویا ہوا ہے۔ یہ حالت ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط جب یہ حالت ہے کہ آواز کو اچھے اور برے بیان کا معیار سمجھا جاتا ہے،

ط فضولیات

اور فرعون کے لفظ پر نیکیاں ملنے پر اشکال کیا جاتا ہے، اور تکرار کو عیب کہا جاتا ہے غرض طبیعتوں میں کجی ہی کجی ہے، تو کیا امید کی جا سکتی ہے؟ کہ کسی بات کے بتانے سے بلا طریقہ انتفاع کی تعلیم کے کارآمد نتائج نکال لئے جائیں گے۔ اس واسطے قرآن میں قصوں کے ذکر کے بعد ان سے انتفاع کا طریقہ بھی تعلیم فرمایا ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ (القرآن) عربی زبان جاننے والے سمجھ لیں گے کہ فِیْ ذٰلِکَ کا اشارہ مذکورہ قصہ کی طرف ہے۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ اشارہ نہ من حیث القصہ ہے بلکہ بحیثیت اس قصہ کے جزو قرآن ہونے کے ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس جزو قرآن سے نفع کس کو حاصل ہوگا؟ جس پر مَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ صادق ہو۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن بتمامہ بندوں کے نفع ہی کے لئے اتارا گیا ہے، تو کسی جزو کی تخصیص کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تو یہاں گو ذٰلِکَ کا مشار الیہ ایک جزو ہے، لیکن مراد کل قرآن ہوا۔

حاصل یہ ہوا کہ قرآن سے انتفاع کا طریقہ یہ ہے جو بیان ہوگا، نہ کہ صرف اس قصہ سے انتفاع کا طریق جو اس سے اوپر مذکور ہے۔ تو سارے ہی قرآن کی یہ حالت ہوئی کہ اس سے انتفاع شرائط مدلولۂ آیت پر موقوف ہے۔

یہ مضمون مجھے اس وقت ضروری معلوم ہوا کیونکہ دیکھا جاتا ہے کہ قرآن تو بہت لوگ پڑھتے ہیں، بلکہ اگر یہ بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ گذشتہ زمانہ سے زیادہ آجکل تلاوت قرآن کی جاتی ہے، بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ مخالفین اسلام بھی قرآن پڑھتے ہیں، لیکن یہ دعوٰی سے کہا جا سکتا ہے کہ "انتفاع بالقرآن" پہلے سے بہت کم، بلکہ قریب قریب مفقود ہے۔

اس کی وجہ یہی ہے کہ شرائط انتفاع مجتمع نہیں۔ بس اس آیت میں انہیں شرائط

کا بیان ہے اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ۔ (القرآن) اور ان شرائط کا بیان قرآن میں اور بھی بہت جگہ ہے، اور ان کو جا بجا مختلف عنوانات سے تعبیر فرمایا ہے۔ کہیں فرمایا ہے۔ "ذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ" اور کہیں "عِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ" اور کہیں فرمایا "لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ" اور کہیں "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّمَنْ یَّخْشٰی" نزول قرآن تو گو نفع عام کے لئے ہے، مگر نفع ہوتا ہے۔ شرائط کے ساتھ اس کو اس مثال سے سمجھ لو! ایک طبیب نے دو شخصوں کے لئے مسہل[1] تجویز کیا اور دونوں کو طریقہ مسہل لینے کا اور شرائط مسہل کے مفید ہونے کے بتائے۔ ان میں سے ایک نے تو مسہل کو ان شرائط کے ساتھ استعمال کیا اور اس کو خاطر خواہ نفع ہوا اور دوسرے نے بغیر شرائط کے استعمال کیا، ظاہر ہے کہ اس کو نفع نہ ہوگا، بلکہ عجب نہیں کہ نقصان پہنچ جائے۔ یہاں کیا بات ہے؟ ظاہر ہے کہ طبیب نے تو دونوں کے لئے نفع کے واسطے مسہل تجویز کیا تھا، لیکن ایک کو طبیب کی تجویز نافع ہوئی اور دوسرے کو نافع نہ ہوئی۔ وجہ کیا ہے، یہی کہ نفع مشروط بالشرائط تھا۔ وَاِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ شرائط نہیں پائی گئیں، نفع بھی نہیں ہوا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ طبیب کی تجویز مفید نہیں تھی، وہ تو مفید تھی، چنانچہ دوسرے کو نفع ہوا اور اس کو جو نفع نہیں ہوا تو بوجہ شرائط موجود نہ ہونے کے نہ ہوا۔

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اثر کے لئے صرف شئ نافع کا وجود کافی نہیں، بلکہ وجود مع الشرائط ہونا چاہیئے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک ہر کام میں یہی بات ہے کہ اثر کے لئے کچھ شرائط ہوتی ہیں، کہ بدون ان کے اثر مترتب نہیں ہوتا۔ اب لوگ قرآن پڑھتے ہیں۔ مگر اثر نہیں ہوتا، یا کم ہوتا ہے، پھر یہ خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ اثر نہیں ہوا۔ نہ معلوم کیا بات ہے۔

---

[1] دست آور دوا

صاحبو! قرآن میں کمی نہیں، ہم میں کمی ہے۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ قرآن سی چیز سے اثر نہ ہو۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں "لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ"۔ (القرآن) یعنی اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو وہ پاش پاش، اور ریزہ ریزہ ہو جاتا (خدا کے خوف سے) تعجب ہے کہ پہاڑ جیسی سخت چیز قرآن سے متاثر ہو اور ریزہ ریزہ ہو جائے، اور انسان جیسی نرم چیز متاثر نہ ہو۔ گو دونوں جگہ اثر حسبِ اقتضائے حکمت مختلف ہو۔ مثلاً انسان چونکہ مکلف ہے۔ اس لئے اس میں تصدع غالباً اس لئے خلافِ حکمت ہو کہ پھر مکلف بہ یعنی قرآن کا نزول عبث ٹھہرتا ہے، کہ عامل ہی مفقود ہو جائے گا۔ اس لئے اس میں اثر صرف "خشوع" کافی ہو گا اور احیاناً تصدع "وزہوق روح" ہو جانا اس لئے خلاف حکمت نہیں کہ اس سے مکلف بہ کا عبث ہونا لازم نہیں آتا۔ کیوں کہ دوسرے مکلفین تو موجود ہیں۔ غرض! انسان میں خشوع تو عام ہو، مگر یہ بھی نہیں جس کی وجہ دوسری جگہ خود ہی فرماتے ہیں "اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا"۔ (القرآن) یعنی قرآن کو غور سے نہیں دیکھتے بلکہ دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں"۔ یہی بات ہے کہ قرآن کی آیتوں میں تدبر نہیں کیا جاتا، اور دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے تدبر سے قرآن کو دیکھا، خواہ موافقین نے، یا مخالفین نے، تو اثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ کیسے کیسے پتھر موم ہو گئے، کیسے کیسے معاندوں[1] نے گردن جھکا دی، اس سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

کسی زمانہ میں قرآن میں یہ اثر تھا کہ معاندین اس کے سامنے پانی ہوتے تھے، اس واسطے اس کے سننے سے بچتے تھے کہ ہمارے اوپر اثر نہ ہو جائے اور اب! لوگوں کو جو اس پر ایمان کے مدعی ہیں، اور جو اس کو پڑھتے ہیں، شکایت ہے کہ اثر نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہی ہے

---

[1] دشمنوں

کہ قرآن کو پڑھتے ہیں مگر تدبر کے ساتھ نہیں پڑھتے، صرف الفاظ پڑھ لیتے ہیں۔ اور یہ بھی ان کا ذکر ہے جو الفاظ کو پڑھ لیتے ہیں، ورنہ اب تو دماغوں میں یہ خبط بھی پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن کے الفاظ کو پڑھنے سے کیا فائدہ؟ جتنا وقت اس میں صرف کیا جائے اتنے وقت میں کوئی ڈگری کیوں نہ حاصل کی جائے۔ اور تدبر و عمل کو جو ہم شرط نفع کی کہہ رہے ہیں، یہاں نفع سے خاص نفع یعنی اثر مراد ہے۔ اور مطلق نفع کی نفی نہیں، مثلاً ہر حرف پر دس نیکیاں ملنا حدیث میں آیا ہے، اس میں یہ شرط نہیں، اور یہ لوگ حسنات ہی کو لاشئے محض سمجھتے ہیں۔ پس ہمارا مقصود اور ہے، ان کا اور، خلاصہ یہ کہ بہت سے مسلمان تو قرآن پڑھتے ہی نہیں، اور جو پڑھتے بھی ہیں تو تدبر کے ساتھ نہیں پڑھتے، جس پر بروئے آیت مذکورہ نفع حاصل ہونا موقوف ہے، تو پھر شکایت عدم نفع کی کیسی؟ مسلمانوں کو تو قرآن سے لگاؤ ہی نہیں رہا، اور اس کے ساتھ یہ جہل مرکب ہے کہ قرآن سے نفع نہیں ہوتا، قرآن سے نفع کیسے ہو، جب تم اس سے لگاؤ ہی نہیں رکھتے۔ اس سے تعجب ہو گا کہ مسلمانوں کو قرآن سے لگاؤ نہیں رہا، کیونکہ قرآن کیسے کیسے عمدہ چھپے ہوئے گھروں میں ہیں۔ تلاوت بھی کی جاتی ہے، پھر یہ کیسے کہا جائے کہ قرآن سے لگاؤ نہیں رہا۔ اس کا جواب یہ ہے، کہ قرآن سے مراد میری! صرف لکھا ہوا قرآن نہیں ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے، بلکہ میری مراد قرآن سے وہ چیز ہے جس کے واسطے قرآن اُترا ہے، جس کے لئے ایک جامع لفظ "دین" ہے جس کے بہت سے اجزاء ہیں۔ جیسے عقائد، اعمال، معاشرات، معاملات، اخلاق، یہ سب وہ اجزاء ہیں جن کے مجموعہ کو دین کہتے ہیں۔ تصوف بھی انہیں اجزاء میں داخل ہے۔ کیونکہ تصوف کی تعریف گیروا کپڑے پہن لینا، یا تعویذ گنڈے کرنا، یا کشف و کرامات نہیں ہے، بلکہ تصوف کی تعریف ہے۔ "تعمیر الظاہر والباطن" اس تعریف کی بنا پر اس کا "دین" ہونا ظاہر ہے۔

غرض! دین ایک جامع لفظ ہے اس کے جس جزو کو لیجئے وہ قرآن ہی میں

داخل ہے۔ حقیقت سب کی واحد ہے، اور صورتیں مختلف۔ کسی لباس میں نام اس کا قرآن ہے، اور کسی لباس میں نام اس کا حدیث ہے، اور کسی لباس میں فقہ ہے ؎

عباداتنا شتّٰی وحسنک واحد　　وکلّ الیٰ ذاک الجمال یشیر

کبھی وہ روشنی چاند کی سی دیتا ہے، اور کبھی آفتاب کی سی، لیکن چاند کی روشنی بھی حقیقت میں آفتاب ہی کی روشنی ہے۔ اس کی ایک موٹی مثال یہ ہے کہ ایک عاشق کسی محبوب کا دلدادہ ہے، اس کے سامنے وہ محبوب ایک لباس میں آتا ہے تو اگر اس کو سچی محبت ہے تو اس کو پہچان لیتا ہے، اور دوسرے لباس میں آتا ہے تب بھی اس کو پہچان لیتا ہے، اور تیسرے لباس میں آتا ہے تب بھی پہچان لیتا ہے اور کہتا ہے

؎ بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　من از رفتار پایت می شناسم

جنھوں نے حقیقت قرآن کی سمجھ لی، وہ حدیث میں بھی قرآن ہی پاتے ہیں، اور فقہ میں بھی قرآن ہی پاتے ہیں، جو کام کرتے ہیں وہ قرآن کے موافق، اور جو فتویٰ دیتے ہیں وہ قرآن کے موافق، اور جو فیصلہ کرتے ہیں۔ وہ قرآن کے موافق کہلائے گا۔ مثلاً یہ واقعہ ہوا کہ کسی نے زنا کیا، اور وہ محصن ہے، اور اس پر باقاعدہ زنا کا ثبوت ہو گیا، تو اس میں کسی عالم نے حدیث کے موافق فیصلہ کیا اور رجم کر دیا۔ تو اگرچہ رجم کا حکم قرآن میں نہیں ہے۔ لیکن اس فیصلہ کو بھی قرآن ہی کا فیصلہ کہیں گے۔ اس واسطے کہ خود قرآن میں حدیث کو واجب الاطاعت قرار دیا ہے۔ تو حدیث کی تعمیل قرآن کی تعمیل ہوئی۔

غرض! قرآن میں دین کے کل اجزاء موجود ہیں، لیکن تصریحاً، اور بعض ضمناً، اور بعض التزاماً، جیسے یہی رجم کا حکم کہ یہ حدیث سے ثابت ہے، اور حدیث کی حجیت قرآن سے ثابت ہے تو بواسطہ رجم کا حکم قرآن ہی میں موجود ہوا۔ زائد سے زائد یہ کہ اس کو بلا واسطہ نہ کہا جائے گا۔ بواسطہ کہا جائے گا۔ تو اس طرح سے کل دین قرآن ہی ہوا۔ گو اس کے

اجزاء میں یہ تفاوت ہوگا کہ اس کے بعض اجزاء ایسے ظاہر ہیں کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے ہم اور بعض اجزاء ایسے ہیں کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں بیان فرمایا، اور بعض اجزاء ایسے ہیں جن کو حدیث سے بھی ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، ان کو مجتہدین اور علماء نے سمجھا۔ تو سب اجزاء دین کے بلاواسطہ، یا بالواسطہ، داخل قرآن ہیں۔ اس واسطے میں نے شروع میں (تقریباً اس مقام سے چار پانچ صفحے قبل جہاں یہ عبارت ہے کہ نہ من حیث القصہ بلکہ بحیثیت قصہ کے جزو قرآن ہونے کے) یہ کہا تھا۔ کہ اس آیت میں قرآن سے) یعنی دین سے، منتفع ہونے کی شرائط۔ حق تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ذٰلِكَ کا مشارٌ الیہ گو خاص توجیہ کی بناء پر ظاہراً قرآن ہے، مگر درحقیقت تمام دین ہے۔ ایک مُتَّفَقٌ علیہ حدیث میں اس اطلاق کی تائید بھی ہے۔ ایک مقدمہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی گئی "اقض بیننا بکتاب اللہ"۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا " لاقضین بینکما بکتاب اللہ"۔ اس کے بعد جو فیصلہ فرمایا گیا ہے۔ " اما غنمک وجاریتک فرد علیک واما ابنک فعلیہ جلد مائۃ وتغریب عام واما انت یا انیس فاغد الیٰ امرأۃ ھذا فان اعترفت فارجمھا الحدیث" اور ظاہر ہے کہ یہ سب تفصیل، قرآن مجید میں کہاں ہے؟ پس لامحالہ یہاں کتاب اللہ سے دین ہی مراد ہے۔

حاصل یہ ہے کہ دین سے منتفع ہونے کے لئے یہ شرائط ہیں، جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں یہ تمہید ہوئی اب میں ان شرائط کو بیان کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ نے ہم کو قرآن جیسی نعمت دی، لیکن مسلمانوں نے اس سے مختلف قسم کے کام لئے۔ بعض لوگوں نے تو اس کو جلد بندھوا کر عمدہ جزدان میں لپیٹ کر طاق پر رکھ دیا، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ طاق نسیان پر پہنچ جاتا ہے۔ جس کام کے لئے قرآن اترا تھا اس کا تو کیا ذکر، کبھی کھول کر بھی دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ ہاں بس اونچے طاق پر عزت کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ اور اس کو قرآن کا بڑا احترام سمجھتے ہیں۔ صاحبو! یہ احترام ایسا ہے جیسے کسی نے

مہمان کا احترام کیا تھا۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک رئیس تھے، انہوں نے اپنے بیٹے کو جہاں اور وصیتیں کی تھیں، وہاں ایک یہ بھی وصیت کی تھی کہ "بیٹا مہمان کا بڑا احترام کرنا، اس کو اونچی جگہ بٹھلانا، اور اس کے سامنے بھاری کپڑے پہن کر آنا، اور اس سے نرم اور میٹھی باتیں کرنا، اور اس کو قیمتی کھانا کھلانا۔" بیٹے عقل کے پورے تھے، باپ کی وصیتوں کو لفظ بلفظ یاد کیا، مطلب خاک بھی نہ سمجھے، لیکن الفاظ خوب رٹے۔ اتفاق سے باوا جان کے ایک خاص ملنے والے، کمبختی کے مارے آ گئے۔ ان کو دیکھتے ہی آپ گھر میں گھس گئے، اور وہاں سے نوکروں کو حکم بھیج دیا کہ ان کو لے جاکر مچان پر بٹھادو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ مہمان صاحب ہر چند بگڑے لیکن نوکروں نے ایک نہ سنی اور زبردستی مچان پر بٹھادیا کہ ہمارے میاں کا یہی حکم ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد گھر میں سے میاں اس ہیئت سے تشریف لائے کہ لنگی کی جگہ تو ایک بہت موٹی شطرنجی لپیٹے ہوئے، اور کرتہ کی جگہ ایک بہت بھاری قالین اوڑھے ہوئے غرض آپ بغلول سے بنکر زمین پر بیٹھ گئے۔ بیچارے مہمان نے وہیں مچان سے تعزیت کرنی شروع کی۔ آپ ہر بات کے جواب میں کبھی گڑگڑ کہہ دیتے کبھی ردی۔ اب مہمان بہت پریشان کہ یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے۔ پھر اس نے میاں صاحبزادے کی خوشامد کی، کہ بھائی! مجھے تم یہاں سے اتار دو۔ خیر اتارے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا لایا گیا وہ انہوں نے کچھ کھایا۔ ایک بوٹی کو توڑنے لگے تو وہ بالکل گلی نہیں تھی، کہنے لگے یہ کیسا گوشت ہے؟ تو صاحبزادے فرماتے ہیں، واہ صاحب کھانے کی اچھی قدر کی، میں نے تو آپ کی خاطر پچاس روپے کا اپنا کتا ذبح کر دیا، اور آپ کا منہ ہی سیدھا نہیں ہوتا۔ جب بہت پریشانی اور حیرت بڑھی، تو مہمان نے پوچھا کہ آخر یہ تمہاری کیا حرکتیں ہیں۔ کہا! میں نے ابا جان کی وصیت پر عمل کرنا ہے، ابا جان کہہ کر مرے تھے کہ مہمان کا بہت احترام کرنا، اس کو اونچی جگہ بٹھلانا، اور اس کے سامنے بھاری کپڑے پہن کر آنا، اور اس سے نرم اور میٹھی باتیں کرنا، اور قیمتی کھانا کھلانا۔ میرے

یہاں کوئی اونچی جگہ اس مچان سے زیادہ نہ تھی اس واسطے اس پر جناب کو بٹھلایا گیا، میں جو آپ کو دیکھ کر جلدی سے گھر میں چلا گیا تھا، یہ اس واسطے تھا کہ بھاری کپڑے پہن لوں۔ اس وقت اس شطرنجی اور قالین سے زیادہ بھاری کوئی کپڑا میرے گھر میں نہ تھا، اس واسطے ان کو پہن لیا۔ اور ابا جان نے کہا تھا کہ مہمان سے میٹھی اور نرم باتیں کرنا۔ تو روئی سے زیادہ نرم، اور گڑ سے زیادہ میٹھی کوئی چیز نہیں، اس واسطے میں انہیں دونوں کا نام زبان سے لیتا رہا۔ اور قیمتی کھانا، اس کے سوا کوئی میری سمجھ میں نہ آیا کہ اپنا پچاس روپیہ کا کتا ذبح کر کے آپ کو کھلا دوں، کیونکہ اس سے زیادہ قیمتی کھانا میرے پاس نہ تھا۔ مہمان بولا، میاں صاحبزادے! جیتے رہو، باپ کی وصیت کو خوب سمجھا، اور اس پر خوب عمل کیا اور لاحول پڑھ کر چلتے ہوئے۔

صاحبو! یہ حکایت تو ایک احمق کی ہے، جس پر ہم سب ہنستے ہیں۔ لیکن اپنی حالت بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ وہ کتاب جو مسلمان کے لئے دین کا معیار ہے، اور جس کا ادب و احترام کرنا ہر مسلمان کے لئے فرض ہے، اس کا احترام ہم نے وہی کیا ہے جو اس احمق صاحبزادے نے مہمان کا کیا۔ اس نے مہمان کو اونچے پر بٹھلا دیا، ہم نے اس کتاب کو اونچے پر رکھ دیا، اور سمجھ لیا کہ کتاب کا احترام ہو گیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ احترام نہیں ہے۔ قرآن کو اونچی جگہ ہی پر رکھو، لیکن اونچی جگہ رکھ کر فارغ تو نہ ہو جاؤ۔ اس کا حق کچھ اور بھی ہے، وہ ادا کرو وہ حق یہ ہے کہ اس کی تلاوت کرو، اس کے مطالب کو سمجھو، اس کے احکام پر عمل کرو۔ نہ یہ کہ بس اٹھا کر ادب سے طاق پر رکھ دو۔

اور بعض نے قرآن سے بس محض یہ کام لیا کہ فال نکال لی، یا بچہ کا نام نکال لیا اور یہ کام میاں جی اور پیر جی لوگ کیا کرتے ہیں۔ محلہ میں کہیں بچہ پیدا ہوا تو وہاں سے فرمائش آتی ہے کہ قرآن میں اس بچہ کا نام نکال دیجئے۔ انہوں نے قرآن کھولا اگر پہلا حرف الف نکلا تو کہہ دیا کہ اللہ بخش نام نکلا، اسی طرح میم نکلی تو معین الدین،

خ نکلی تو خدا بخش، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ نام بڑا متبرک ہے کیونکہ قرآن سے نکلا ہے حالانکہ یہ محض پیٹ کا دھندا ہے اور کچھ بھی نہیں۔ صاحبو! یہ کیا جہالت ہے؟ اور لیجیے، بعض لوگوں نے قرآن سے یہ کام لیا کہ جب کہیں موت ہوئی تو تیجے میں قرآن خوانی کرادی، اور الٹا سیدھا ثواب بخش دیا۔ اس کو تو بہت ہی بڑا کام سمجھا جاتا ہے۔ اس کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو لڑائیاں ہوتی ہیں، فتوے لگتے ہیں، رسالہ بازیاں ہوتی ہیں۔ اس کے متعلق بھی میں اس وقت صرف یہی کہتا ہوں کہ اس پر حصر کیوں کرتے ہو۔ اس کو کر کے یہ کیوں سمجھ لیتے ہو کہ بس ہم نے قرآن کا حق ادا کر دیا۔

الٹا سیدھا اس واسطے کہا کہ گو ایصالِ ثواب کرنے سے ثواب پہنچتا ہے، اس سے انکار نہیں، مگر اس کے واسطے کچھ شرائط بھی تو ہیں۔ وہ شرائط متعارف قرآن خوانی میں نہیں پائے جاتے، اس واسطے اس میں کلام ہو سکتا ہے، کہ اس طرح قرآن خوانی کرانے سے ثواب پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔ خبروں کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، یہ بحث دوسری جگہ موجود ہے۔ اور سنیئے، بعض نے قرآن سے یہ کام لیا کہ.... چادر میں رکھ کر دو آدمیوں نے دونوں طرف سے پکڑ کر بچہ کو اس کے نیچے سے نکال دیا، اور کہتے ہیں کہ اس سے حفاظت ہوتی ہے، اور بچہ بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔ جی ہاں تمہاری اس ہوا ہی کے لئے تو قرآن نازل ہوا تھا۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ قرآن کی ہوا میں بھی برکت ہے، مگر سوال یہ ہے کہ قرآن بس اسی واسطے نازل ہوا تھا؟ یہ تو ایسا ہے جیسے دوشالہ سے غرض تو یہ ہے کہ اس کو اوڑھا جائے، مگر کسی گنوار نے کیا کیا کہ باوجود اس کے کہ جنگل سے لکڑی، ایندھن لاکر جلا سکتا تھا، مگر اس نے دوشالہ جلا کر اس کے اوپر کھچڑی پکائی۔ تو اس طرح اس بیوقوف نے دوشالہ کو برباد کیا، ہاں یہ منفعت ضرور ہوئی کہ کھچڑی پک گئی، مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اس نے اچھا کیا۔ اس پر یہی اعتراض تو ہے کہ اس نے دوشالہ سے

یہ کام لے کر اس کے اصلی منافع تلف کر دیئے۔ کیونکہ کھچڑی پکانا تو لکڑی ایندھن سے بھی ہو سکتا تھا۔ اس کو عقلاً حق تلفی کہیں گے، کیونکہ جس کام کے لئے دوشالہ موضوع تھا۔ اس سے وہ کام نہیں لیا گیا۔ بس اسی طرح قرآن سے ایسے کام لینا جیسے ابھی بیان کئے گئے قرآن کی حق تلفی ہے۔ وہ کام تو احد چیزوں سے بھی نکل سکتے ہیں قرآن سے ایسے کام لینا ایسا ہی ہے جیسے ایندھن ہوتے ہوئے دوشالہ کو جلا کر کھچڑی پکانا۔

اور بعض نے قرآن شریف سے یہ کام لیا کہ تعویذ گنڈے شروع کر دیئے۔ اور یہ تو ایسا بڑا کام سمجھا جاتا ہے کہ آجکل بزرگی اور ولایت کا معیار یہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلانے بڑے بزرگ ہیں، ان کے تعویذ حکمی اثر رکھتے ہیں۔ میں اس کے متعلق بھی یہی کہتا ہوں کہ قرآن سے کبھی کبھی یہ کام بھی لیا جائے تو مضائقہ نہیں، مگر اس پر حصر کیوں کیا جاتا ہے؟ یہ کیوں سمجھ لیا گیا ہے کہ بس قرآن اترا اسی واسطے ہے۔ خود قرآن سے پوچھو کہ وہ اپنے نزول کی غایت کیا بیان کرتا ہے۔ قرآن میں ہے "کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْۤا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ" (القرآن) یعنی حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہے کہ "قرآن ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اتارا ہے، اور وہ برکت والی ہے، اور غرض اس کے اتارنے سے یہ ہے کہ لوگ اس کی آیتوں کو تدبر سے پڑھیں، اور اہل عقل اس سے نصیحت حاصل کریں"۔ لیجئے! جو کام ہم لوگ آجکل قرآن سے لیتے ہیں ان کا کہیں بھی ذکر نہیں، نہ فال نکالنے کا، نہ نام، نکالنے کا، نہ بچہ کو ہوا دینے کا، نہ تعویذ گنڈے لکھنے کا۔ مگر افسوس! ہم نے یہ حشر کیا ہے قرآن کا کہ اس سے وہ کام تو لیتے ہیں جس کے واسطے وہ نہیں اتارا گیا، اور وہ کام نہیں لیتے جس کے لئے وہ اتارا گیا ہے۔ اور یہ میں پہلے ہی کہہ آیا ہوں کہ قرآن سے مراد میری خاص یہی کتاب نہیں ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے، بلکہ مجموعہ دین مراد ہے جس میں فقہ اور حدیث سب

داخل ہے، جس کی مختصر تعبیر دین ہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ دین کی ہر بات کو ہم نے ایسے طریق سے استعمال کیا ہے کہ وہ طریق ہی اس کے استعمال کا نہیں ہے، اسی واسطے ہم کو اس سے کچھ نفع نہیں ہوتا۔ بس اس وقت وہی طریق اور نفع کی شرط بیان کرنا مقصود ہے۔ اور اس کا بیان اس آیت میں ہے جو تلاوت کی گئی۔ جو کوئی اس شرط کے ساتھ استعمال کرے گا اس کو تو نفع ہوگا، اور جو اس شرط کے ساتھ استعمال نہ کرے گا اس کو نفع نہ ہوگا۔

میرے بیان سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھ لیں کہ میں تعویذ یا عملیات کو منع کرتا ہوں اگر ان کے واسطے بھی آیات قرآنی کو کبھی کام میں لایا جائے تو مضائقہ نہیں۔ مگر لوگوں کی حالت مختلف ہے۔ ایک تو وہ شخص ہے کہ قرآن پڑھتا ہے، اور اس کے موافق عمل بھی کرتا ہے، تمام احکام کو بجالانے کی کوشش کرتا ہے، اور کبھی عند الحاجت رقیہ کے طور پر بھی آیات سے کام لے لیتا ہے، اس میں مضائقہ نہیں۔ اور ایک وہ شخص ہے کہ قرآن سے سوائے تعویذ گنڈے، اور جھاڑ پھونک کے کوئی کام ہی نہیں لیتا۔ نہ عقائد ٹھیک ہیں نہ اعمال ٹھیک ہیں، نہ صورت شریعت کے موافق ہے، نہ سیرت۔ اس کو یہی کہا جائے گا کہ تجھے ہرگز حق نہیں قرآن کو اس کام میں لانے کا، تو قرآن کا حق تلف کرتا ہے۔ اس کو اس مثال سے سمجھئے کہ دوشالہ موضوع تو ہے اوڑھنے ہی کے لئے، لیکن جو شخص ہمیشہ تو اس کو اوڑھتا ہی ہے، لیکن کبھی ضرورت پڑی تو اس نے اس کو پردہ کی جگہ بھی ٹانگ دیا۔ تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جائے گا۔ اور ایک شخص ہے کہ دوشالہ کو ہمیشہ شطرنجی ہی کی جگہ بچھاتا ہے، یا ہمیشہ سائبان ہی کا کام اس سے لیتا ہے، تو اس کو ضرور بے وقوف کہا جائے گا۔

غرض قرآن کو اگر کبھی کبھی تعویذ کے لئے، یا برکت کے لئے بھی کام میں لایا جائے تو مضائقہ نہیں۔ مگر صرف اسی کو مقصود قرآن کا نہ سمجھیں (مجھ سے اگر کوئی تعویذ مانگتا ہے تو میں دیکھ لیتا ہوں کہ اس شخص کو تعویذ دینے سے اس خیال فاسد کی تائید تو نہ ہوگی

کہ قرآن کا مقصود محض یہی ہے۔ اگر قرائن سے معلوم ہوا کہ تائید ہوگی تو اس شخص کو میں تعویذ نہیں دیتا، اور اگر معلوم ہو کہ وہ آدمی سمجھدار ہے اور یہ اثر اس پر نہ ہوگا تب دے دیتا ہوں) میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن کے ساتھ جو برتاؤ ہم کو کرنا چاہیے تھا وہ ہم نہیں کرتے، اسی واسطے جو نفع تھا قرآن کا وہ ہم کو حاصل نہیں ہوتا۔ یہی بیان اس آیت میں ہے کہ قرآن سے انتفاع کے لئے ایک خاص طریق ہے۔ اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ محض حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس طریق کو خود بیان فرما دیا، ورنہ یہ بات تو ہمارے پوچھنے کی تھی۔ قرآن کا اتارنا حق تعالیٰ کا کام تھا اور اس سے انتفاع کا طریقہ ہم کو پوچھنا چاہیئے تھا۔ مگر پوچھتے تو کیا بتلانے پر بھی سن لیں تو غنیمت ہے، چنانچہ یہی واقع ہو رہا ہے۔

دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ وعظ کو صرف اس خوف سے نہیں سنتے کہ اس کے موافق عمل کرنا پڑے گا۔ کیوں خواہ مخواہ اپنے سر بلا لی۔ کوئی پوچھے! کہ کیا اس صورت میں یہ عذر آپ کا چل جائے گا؟ کہ ہم نے وعظ نہیں سنا تھا، ہمیں گناہوں کا گناہ ہونا معلوم ہی نہیں ہوا تھا، اس واسطے گناہ کرتے رہے۔ کیوں صاحب! آپ ایک قتل کر دیں، تو کیا عدالت میں یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ میں نے قتل کی ممانعت کا قانون نہیں سنا تھا، یا یہ عذر کریں کہ لوگ مجھ کو ممانعت سناتے رہے مگر میں نے سنی نہیں تھی۔ بلکہ یہ تو دوہرا جرم ہوگا کہ سننے سے بھی انکار کیا۔ اسی طرح وعظ سننے کے خوف سے اوامر[1] حق تعالیٰ کے ساقط نہیں ہو جائیں گے یہ محض حیلہ ہے نفس کا، اور سستی و غفلت ہے، اور دین سے بُعد ہے۔ ذمہ تو آپ کے یہ تھا کہ طریقہ انتفاع کا خود پوچھتے مگر اس کی امید کسی طرح نہ تھی، اس واسطے حق تعالیٰ نے اس کو خود ہی بیان فرما دیا۔ اگر آپ بیان کرنے پر سن ہی لیں تو غنیمت ہے۔

عجیب بات ہے کہ دین کے بارہ میں جو کچھ بتلایا جاتا ہے بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ

---

[1] احکامات الٰہی

کے احسان مند ہوں، الٹا اس کے سننے کا احسان رکھتے ہیں۔ اس کے تو یہ معنے ہوئے کہ دین خدا تعالیٰ کے فائدہ کا کام ہے، اس کو پورا کرنا یا اس کے متعلق کچھ کہنا سننا یہ سب ہماری طرف سے تبرع ہے۔ اور اس غلطی میں صرف عوام ہی مبتلا نہیں، بلکہ خواص بھی مبتلا ہیں۔ عوام تو خیر عوام ہی ہیں، زیادہ تعجب خواص سے ہے، کہ اگر کوئی کام کرتے ہیں۔ یا کسی بات کا ان کو علم ہوتا ہے، تو یہ نہیں سمجھتے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو توفیق اس عمل کی دی، یا ہم کو علم دیا۔ ٹٹول کر دیکھ لیں کہ عمل یا علم کے بعد طبیعتوں میں ایک قسم کا ناز پیدا ہوتا ہے، کہ ہم نے ایک کام کیا، اور اپنا کام نہیں بلکہ حق تعالیٰ کا کام کیا، یا علم کی وجہ سے حق تعالیٰ کا کام کیا، یا علم کی وجہ سے حق تعالیٰ کے مقرب ہو گئے۔ خواص میں اس غلطی کا منشار ایک دھوکہ ہے، وہ یہ ہے کہ بعض نصوص میں اس قسم کے الفاظ ہیں۔ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ اور اُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ جن میں عمل کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور اس پر جزا کو مترتب کیا گیا ہے۔ تو اس سے ان کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس حالت میں اگر ہم بھی عمل کو اپنی طرف منسوب سمجھیں، اور اپنے کو جزا کا مستحق سمجھیں تو کیا بیجا ہے؟

میں اہل علم کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ عمل کی نسبت کسی درجہ میں آپ کی طرف ضرور ہو سکتی ہے لیکن اس کے اسباب کا مہیا ہونا، یا موافق کا رفع ہونا، آپ کے اختیار سے ہوا یا کسی اور کے اختیار سے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ آپ کے اختیار سے ہوا۔ مثلاً نماز پڑھی یہ عمل آپ نے کیا آپ کو مصلی کہہ سکتے ہیں، لیکن نماز ہاتھ پیر سے پڑھی جاتی ہے، ہاتھ پیر میں قوت کہاں سے آئی؟ کیا وہ بھی آپ ہی نے پیدا کی، یا کوئی مانع پیش نہ آیا، کیا کسی مانع کا پیش نہ آنا بھی آپ ہی کی قوت سے ہوا؟ ہرگز نہیں یہ سب دوسرے کے عطایا ہیں۔ پھر جب نماز ہاتھ، پیر، پر موقوف ہے اور ان کا کام دینا مانع نہ ہونے پر موقوف ہے۔ اور یہ سب دوسرے کے کام ہیں، آپ کے اختیار میں نہیں تو نتیجہ تو وہی نکلا کہ عمل کے اختیار میں نہیں۔ اب جو نسبت عمل کی آپ کی طرف کی جائے،

تو وہ محض آپ کے دل خوش کرنے، اور ہمت بندھانے کے لئے ہے اور غایت درجہ کی شفقت اور کرم ہے۔ اس کی قدر اور اس پر شکر کرنا چاہیئے۔ نہ کہ دعوای اور فخر کیا جائے۔

دیکھئے! بعض وقت طبیب کسی جاہل آدمی سے جس سے خاص تعلق ہو یا کسی ایسے بچے سے جس سے تعلق ہو، از روئے ترحم کہہ دیتا ہے، کہ یہ دوا پی لو اور اس میں وہ حیلہ وحجت کرتا ہے، تو طبیب کہتا ہے کہ میرا کام سمجھ کر کرلو، اور اپنے اوپر رحم نہ کرو بلکہ میرے اوپر رحم کرو۔ تو کیا اس کہنے سے دوا کا پینا سچ مچ طبیب کا کام ہوگیا، جو کوئی ایسا سمجھے وہ دیوانہ ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر عمل کی نسبت آپ کی طرف کی گئی، تو کیا وہ سچ مچ آپ ہی کا عمل ہوگیا؟ یہ صرف حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ اپنا احسان نہیں جتلانا چاہتے، اس واسطے عمل کو آپ کی طرف منسوب کردیا۔ قیامت میں یہی ہوگا کہ اعمال کی جزا کہہ کر درجات دیئے جائیں گے۔ وَنُودُوا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (القرآن) یعنی ندا دی جائے گی کہ یہ جنت تم کو تمہارے اعمال کے بدلے دی جاتی ہے۔ اور حقیقت وہی ہے، جو میں نے بیان کی۔ کہ یہ سب کرم وفضل ہے۔ کیونکہ ہمارے اعمال موقوف ہیں آلات پر اور آلات ہمارے اختیار میں نہیں۔ تو قاعدہ سے ہمارے اعمال بھی من کل الوجوہ ہماری قدرت میں نہ ہوں گے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے اپنے کسی غلام کو ایک چیز دینی ہے۔ مگر اپنا نام کرنا نہیں ہے۔ اس واسطے پہلے اس کو ایک اشرفی دے دی، پھر کہدیا یہ چیز ہم سے ایک اشرفی کے بدلے خرید لو۔ اس نے تو سچ بتلائے کہ ضابطہ شرعیہ واقعیہ سے یہ چیز اس کی ہوئی یا دینے والے کی ہوئی۔ خریدا تو اس نے بیشک ہے لیکن وہ اشرفی جس سے اس نے خریدا ہے وہ کہاں سے آئی تھی؟ وہ تو اسی نے دی تھی۔ تو درحقیقت یہ سب کچھ اسی کی عطا ہوئی، اور وہ بھی تمہارے ہی نفع کے لئے۔ چنانچہ ذرا اوپر کی تقریر سے ظاہر ہے جہاں اس غلطی کا بیان کیا گیا ہے کہ بجائے

اس کے کہ خدا تعالیٰ کے احسان مند ہوں الٹا اپنا احسان رکھتے ہیں۔

مگر ذرا سوچو! سیدھی سی بات ہے کہ عبادت اور عمل بالقرآن کس کے نفع کا کام ہے، خدا کا یا تمہارا؟ بتایا ہوا تو بیشک خدا کا ہے، مگر اس سے نفع تمہارا ہے۔ بلکہ اگر خدا تعالیٰ نے کسی کام کا حکم دیا تو ہمارے ذمہ بحیثیت بندہ ہونے کے اس کا امتثال بہرحال واجب ہے۔ خواہ ہمارا کچھ نفع ہو، یا نہ ہو، بلکہ نقصان ہو تب بھی واجب ہے، چہ جائے کہ اس پر اجر کا بھی وعدہ ہے۔ جب یہ ہے، تو اس کے طریقہ کا پوچھنا بھی ضابطہ سے ہمارے ہی ذمہ واجب ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہماری لاپرواہی سے یہ امید کہاں کی جاسکتی تھی کہ طریقے پوچھیں گے۔ لہٰذا ازراہِ کرم، بلا ہمارے پوچھنے کے خود ہی طریقے بھی بتا دیئے۔ اس کرم کی بہت قدر کرنا چاہیئے۔ میری اس تقریر سے اس کی حقیقت بھی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ بعض اعمال کو جو حقوق اللہ کہا گیا ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ خدا کے ذاتی نفع کے کام ہیں، جن کو وہ اپنی کسی ضرورت سے تم سے لینا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس کی حقیقت وہی ہے، جو طبیب اور مریض کی مثال میں بیان کر چکا ہوں کہ بعض وقت طبیب کسی مریض سے خاص تعلق کی وجہ سے کہتا ہے۔ کہ میرا کام سمجھ کر دوا پی لو، اسی طرح بعض اعمال کو حقوق اللہ کہہ دیا گیا ہے تاکہ ہم خدا ہی کا کام سمجھ کر ان کو کرلیں، اور اس کی جزا کے مستحق ہوجائیں۔

اب لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کا کام کر رہے ہیں۔ بعضے رات کو اٹھتے ہیں، بارہ تسبیح کا ذکر کرتے ہیں، پھر دل میں ناز کرتے ہیں کہ ہم ذاکر ہیں۔ اور اپنی بزرگی کے خود ہی معتقد ہوجاتے ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ پر احسان رکھتے ہیں۔ ارے بیوقوف! تم خدا کا کام کرتے ہو یا اپنا اور اس میں بزرگی کی کیا بات ہے، اوّل تو یہ خدا کا کام نہیں تمہارا ہے اگر ہو بھی تو تم نے کیا کیا؟ خدا ہی نے تو توفیق دی اور اسباب مہیا کیے تب تم کام کر سکے۔ تو اس کی حقیقت وہ ہی ہوئی یا نہیں جو میں نے ابھی کہا کہ ایک شخص کسی کو کچھ دیتا ہے، مگر دینے والا ایسا کریم ہے کہ اپنا نام کرنا اور احسان جتلانا نہیں چاہتا، اس واسطے

پہلے اس کو ایک اشرفی دے دیتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ اس اشرفی کی یہ چیز ہم سے خرید لو۔ کون عقلمند خریدار ہے جو اس خریداری کا احسان الٹا اس دینے والے پر رکھے درحقیقت تو سب اسی کا احسان وکرم ہے، ایسے دینے والے پر تو قربان ہو جانا چاہیئے۔

سچ یہ ہے کہ ہمارے دماغ بگڑ گئے ہیں، دین تو خود ہمارا کام تھا، نماز پڑھتے، روزہ رکھتے، تمام ارکان دین بجا لاتے، اور احسان مانتے۔ کیونکہ ہم کو ان کا فائدہ ملنے والا ہے لیکن خیالات الٹے ہو گئے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں اور اس پر ناز کرتے ہیں۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ یہ دوسرے کا کام ہے۔ جب ایسا مذاق خراب ہوا ہے تو عجب نہیں کہ دین کو بیکار اور اپنے ذمہ بار سمجھنے لگیں، پھر نتیجہ یہ ہو کہ ان تمام ثمرات سے جو اس پر موعود ہیں محروم رہیں۔ اسی محرومی سے بچانے کے لئے بعض اعمال کو حق اللہ کہہ دیا گیا ہے کہ اپنا کام سمجھ کر نہیں کرتے تو خدا ہی کا کام سمجھ کر کر لو۔ گو یہ خلاف حقیقت ہے لیکن اس عنوان میں بھی ایک کام کی بات ہے، وہ یہ کہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کام کرتا ہے، اور اس میں لگا رہتا ہے تو کام خود فہم کو درست کر لیتا ہے۔

دیکھئے! بچہ کو پڑھنے بٹھاتے ہیں تو اس پر کس قدر گرانی ہوتی ہے، اور وہ کسی طرح پڑھنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا، اگر مربی یہ کہہ کر اس کو چھوڑ دے کہ یہ کام تیرا ہی تو تھا، تیرا دل نہیں لگتا تو جا بھاڑ میں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ ہمیشہ جاہل ہی رہے۔ اس کو کوئی سمجھدار اور اس کا بھی خواہ پسند نہیں کرتا، بلکہ بچہ کو خوشامد درآمد سے، زجر و تنبیہ سے، لالچ سے، پیسے دے دے کر، راہ پر لگاتے ہیں۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ جب وہ الٹا سیدھا جس طرح بھی ہو پڑھنے میں لگ جاتا ہے، تو اس کی سمجھ خود درست ہو جاتی ہے۔ اسی معنی کر کہا جاتا ہے کہ کام خود بخود فہم کو درست کر لیتا ہے۔

بس اسی فائدہ کے لئے یہ کہا گیا کہ اگر تم دین کو اپنا کام نہیں سمجھتے، اور اس سے تمہیں

وحشت ہے، تو اس کو خدا ہی کا کام سمجھ کر کر لو، جب کام میں لگ جاؤ گے تو کام تمہارے فہم کو خود درست کر لے گا۔ یہ وجہ ہے بعض اعمال کو حق اللہ کہنے کی بہر حال کام میں لگانا چاہتے ہیں، اور اس کے ثمرات دینا چاہتے ہیں، اس کی قدر کرنا چاہیئے، کہ باوجود بے نیازی کے، کام بتانے کے ساتھ اس کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ اگر کام ان ہی کے بتائے ہوئے طریقہ سے کیا جائے گا تو نفع یقینی اور بہت جلد ہوگا۔ اگر قرآن سے تعلیم ان طریقوں کے مطابق لی جائے، جو قرآن نے بتائے ہیں، تو ناممکن ہے کہ نفع نہ ہو۔

وہ طریقے کیا ہیں؟ اسی کو فرماتے ہیں "اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى (القرآن) یعنی اس بیان میں (اس سے اوپر امم سابقہ کے کفار کے اہلاک کا ذکر ہے) نصیحت ہے، مگر کس کو جس میں دو باتیں ہوں، اور دو کا ذکر علی سبیل منع خلو ہے یعنی دونوں سے خالی نہ ہو، خواہ دونوں جمع ہو جائیں، چنانچہ یہاں ہر واحد بھی کافی ہے، اور دونوں کا اجتماع بھی ممکن ہے۔ اس پر دلائل مستقلہ قائم ہیں (اس کا بیان بقدر ضرورت ختم وعظ کے قریب جہاں سے "اَلْقَى السَّمْعَ" کا بیان شروع ہوا مذکور ہے ۱۲) وہ دو باتیں کیا ہیں۔ لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (القرآن) یعنی جس کے پاس قلب ہو۔ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ (القرآن) یعنی کان کو متوجہ ہو کر لگا دے۔" ان دونوں لفظوں کا ترجمہ ذرا سا ہے، اور لفظ بھی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ اس اختصار سے تعجب ہوگا کہ ذرا ذرا سی چیزیں ہیں، اور ذرا سی بات ہے، جس پر تمام دین کا نفع مبنی ہے، اس تعجب کا رفع میں کئے دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ سمجھ لیجئے کہ قرآن منطق کی اصطلاح میں نہیں نازل ہوا، بلکہ سامعین کے محاورات میں نازل ہوا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورہ میں ہے، کہ یہ دل گردہ والے کا کام ہے۔ اس کے اگر لغوی معنے لئے جائیں تو کلام بلاغت سے بہت ہی گرا ہوا ہو جاتا ہے۔ بلکہ مفہوم ہی غلط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں تو یہ معنے ہو جائیں گے کہ جس کے جسم میں دل اور گردہ ہو وہ یہ کام کر سکتا ہے۔ سو دل اور گردہ تو ہر انسان کے جسم میں موجود ہیں، تو اس کے تو یہ معنے ہو گئے

کہ ہر انسان یہ کام کر سکتا ہے۔ حالانکہ یہ جملہ بولا جاتا ہے ایسے موقع پر کہ اس کام کو ہر انسان نہ کر سکے۔ بات یہ ہے کہ لغت اور محاورہ میں فرق ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ محاورہ میں لغوی معنی پر ایک زیادتی ہوتی ہے اور وہ ہی مراد ہوتی ہے۔ مثلاً یہاں دل سے مراد لغوی دل نہیں، بلکہ وہ دل مراد ہے جس میں صفات دل ہوں اور گردہ سے مراد لغوی گردہ نہیں، بلکہ وہ گردہ مراد ہے جس میں صفات گردہ ہوں۔ اور دل کی صفت ہے ہمت۔ اور گردہ کی صفت ہے قوت۔ تو اس لفظ کے یہ معنے ہوئے کہ یہ کام وہ کر سکتا ہے جس میں ہمت و قوت ہو۔ دیکھئے! اب یہ لفظ کیسا بلیغ ہو گیا، اور اس موقع پر کیسا چسپاں ہو گیا، جس میں یہ بولا جاتا ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ ایک حاکم کہتا ہے کہ ہمیں ایک آدمی کی ضرورت ہے، اس کے لغوی معنی تو یہ ہیں کہ ایک ایسا شخص تلاش کیا جائے جس پر آدمی کا اطلاق ہو۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہو۔ اب کسی نے اس پر یہ عمل کیا کہ ایک ایسے انسان کو جو نہایت درجہ بیمار اور اپاہج ہے، ڈولی میں ڈال کر لے آیا، اور حاکم کے سامنے پیش کر دیا کہ لیجئے حضور آدمی حاضر ہے۔ حالانکہ اس میں کسی کام کے کرنے کی قوت تو درکنار حواس بھی پورے موجود نہیں، بس ایک مضغۂ گوشت ہے، ہاں سانس چل رہا ہے۔ اب آپ ہی فرمائیے! کہ کیا اس کے حکم پر عمل ہو گیا؟ لغۃً تو ہو گیا کیونکہ آدمی کا اطلاق اس پر صادق آتا ہے، آخر وہ بھی اولادِ آدم تو ہے ہی۔ اور از روئے منطق بھی وہ آدمی ہے، کیونکہ حیوانِ ناطق ہے۔ اور ناطق کے معنے بولنے والا نہیں، جیسا کہ عرف عام میں سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس کے معنے ہیں "مدرک کلیات و جزئیات"، جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں یہ سب کچھ ہے۔ لیکن اس حاکم کے سامنے ایسے مریض انسان کا پیش کرنا امتثال امر نہیں سمجھا جاتا۔ وجہ کیا ہے؟ کہ جو اغراض آدمی کے متعلق ہیں۔ جن کے واسطے حاکم آدمی مانگتا ہے، وہ اس سے حاصل نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کمزور آدمی کو بھی

پیش کیا جائے تو اس کو بھی وہ منظور نہیں کرے گا، کیونکہ وہ تو ایسے آدمی کو چاہتا ہے جو خدمت گزاری اچھی طرح کر سکے، اور یہ کام بہت ہٹے کٹے اور توانا و تندرست آدمی کا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جس کام کے لئے آدمی چاہیئے اگر اس سے وہ کام نہیں ہو سکتا تو اس سے آدمیت ہی کی نفی کی جاتی ہے۔ اسی معنے کر یہ کہا گیا ہے ؎

آنرا کہ عقل و ہمت و تدبیر و رائے نیست　　خوش گفت پردہ دار کہ کس در سرائے نیست

دیکھئے! کس کی نفی کی گئی ہے حالانکہ وہاں آدمی موجود ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ وہ محض لغوی آدمی ہیں، ایسے آدمی نہیں جن سے وہ غرض پوری ہو جو آدمی سے پوری ہوتی ہے، یعنی لغوی آدمی ہیں، اصطلاحی نہیں ہیں۔ امراء کے یہاں تو یہ محاورہ بہت مستعمل ہے، کہا جاتا ہے کہ آپ فلاں تجارت شروع کیجئے، یا فلاں محکمہ کھولئے، تو کہتے ہیں میں مجبور ہوں، میرے پاس کوئی آدمی نہیں ہے۔ یعنی اس کام کا آدمی نہیں ہے۔ یوں لغوی آدمی تو بہت سے موجود ہیں۔ خلاصہ یہ کہ محاورات میں محض لغت پر نظر نہیں ہوتی، بلکہ حصولِ اغراض پر نظر ہوتی ہے۔ اب سمجھ میں آجائے گا۔ لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (القرآن) کے کیا معنے ہیں۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ جس کے جسم میں دل بمعنی مضغۂ گوشت ہو، بلکہ وہ دل ہو جس سے وہ اغراض حاصل ہو سکیں جس کے لئے دل ہوتا ہے، وہ اغراض کیا ہیں؟ ادراک، یعنی بھلے برے کو سمجھنا، اور ارادہ جس سے نافع کو اختیار اور مضر کو ترک کر سکے۔ ان ہی کو شرعی اصطلاح میں علم اور عزم کہتے ہیں تو دو صفت ہوئیں قلب کی۔ علمؔ اور عزمؔ۔ میں نے یہ دونوں لفظ (یعنی علم اور عزم) پہلے نہیں استعمال کئے، بلکہ بجائے ان کے دوسرے الفاظ، یعنی ادراک و ارادہ استعمال کئے تھے اس واسطے کہ آج کل ایسی بدمذاقی پھیل رہی ہے کہ اپنے علوم، یعنی علوم دینیہ کی اصطلاحوں سے بھی اجنبیت ہو گئی۔ اسی واسطے میں نے اوّل عام محاورات سے تفہیم کرکے اس کے بعد ان لفظوں کا استعمال کیا۔ غرض دو صفت ہیں قلب کی علمؔ اور عزمؔ۔ جب یہ دونوں

صفتیں موجود ہوں گی تب کہا جائے گا کہ اس پر لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ (القرآن) صادق ہے۔

اب ایک دوسری بات سنیئے! وہ یہ کہ یہ عام قاعدہ ہے کہ جس فن میں گفتگو ہوتی ہے۔ تمام گفتگو میں اسی فن کی اصطلاحیں بولی جایا کرتی ہیں۔ جیسے اقلیدس مین اصول موضوعہ ہیں۔ کہ اوّل ان کو بیان کر دیا جاتا ہے، اس کے بعد تمام اقلیدس میں جہاں اصول موضوعہ کا لفظ آتا ہے انہیں اصول میں سے کوئی مراد ہوتا ہے کسی دوسرے فن کے اصول مراد نہیں ہوتے۔ یا علم حساب کی اصطلاح میں بعض الفاظ مقرر ہیں جیسے جمع، تفریق، ضرب۔ ان کے خاص خاص معنی ہیں۔ علم حساب میں جہاں جہاں وہ لفظ بولے جائیں گے وہی معنی مقررہ مراد ہوں گے، کہیں جمع سے مراد مجمع کرنا، یا تفریق سے مراد مجمع کو منتشر کرنا، یا ضرب سے مراد مارنا نہیں ہوگا۔ غرض ہر فن کی اصطلاحات جُدا ہیں۔

دین بھی ایک فن ہے، اس کے متعلق بھی کچھ اصطلاحات ہیں۔ اور ان ہی میں سے ایک لفظ "علم" بھی ہے۔ دین میں اس سے مراد مطلق جاننا نہیں ہوتا، بلکہ مراد علم دین ہوتا ہے، کسی اور چیز کا جاننا مراد نہیں ہوتا۔ اس غلطی میں بہت سے ہمارے بھائی پڑے ہوئے ہیں کہ قرآن، حدیث، اور دین کی کتابوں میں علم کی فضیلت دیکھتے ہیں تو اس سے مراد کیا لیتے ہیں کوئی زراعت و فلاحت لیتا ہے، کوئی تجارت لیتا ہے، کوئی صنعت و حرفت لیتا ہے۔ یوں تو بڑی گنجائش نکلے گی، وہ کام بھی اس میں داخل ہو جائیں گے جن کو تمام دنیا بُرا کہتی ہے، جیسے چوری، حرام کاری، ڈاکہ زنی وغیرہ کہ ان کا جاننا بھی تو علم ہی کی ایک فرد ہے۔ تو دین کیا ہوا؟ مجموعہ ہوا حسن اور قبیح کا۔ اور مجموعہ حسن اور قبیح کا قبیح ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پلاؤ، قورمہ، میں نجاست ملا دی جائے تو اس مجموعہ کو کوئی اچھا نہ کہے گا۔ یہ کوئی مذہب والا بھی نہیں کہہ سکتا کہ بُری باتوں کا

جاننا بھی مذہبی علم ہے۔ لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ جس فن میں گفتگو ہو اس میں اسی فن کا جاننا علم کہلائے گا۔ یہاں دین کا بیان ہو رہا ہے تو یہاں علم سے مراد علم دین ہی ہو گا۔

میں نے جو کہا تھا کہ دو صفت ہیں قلب کی جن پر دین سے منتفع ہونا موقوف ہے، اور وہ دو صفت "علم اور عزم" ہیں تو اس سے مراد یقیناً علم دین ہی ہے۔ اور اگر میں ترقی کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ علم کا مصداق صرف ایک علم "دین" ہی ہے۔ دوسرے علوم اس کے سامنے علوم ہی نہیں ہیں۔ اس سے تعجب نہ کیجئے۔ دیکھئے! کفش[1] دوزی بھی ایک کام ہے، اور زراعت و فلاحت بھی ایک کام ہے، کیا کفش دوزی کے علم کو زراعت و فلاحت کے علم کے سامنے آپ علم کہیں گے؟ اگر ایسا ہے تو چمار[2] اور کاشتکار برابر ہوں گے۔ آفتاب کے سامنے تاروں کو کوئی منور نہیں کہتا۔ حالانکہ تاروں میں بھی روشنی یقیناً ہے، پھر ان کو آفتاب کے سامنے منور کیوں نہیں کہا جاتا، حتیٰ کہ وہ آفتاب کے سامنے نظر بھی نہیں آتے۔ دن کو تارے کہیں چلے تھوڑا ہی جاتے ہیں، بلکہ آفتاب کے سامنے ان کی روشنی ماند ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جس سے پوچھئے دن کے وقت یہی کہے گا کہ تارے اس وقت نہیں ہیں۔ وجہ کیا ہے؟ کہ ان کی روشنی اس وقت آفتاب کے مقابلہ میں ماند ہو گئی ہے۔ تو تاروں کی صفتِ خاص یعنی "روشنی" ماند ہو جانے کی وجہ سے ان کی ذات پر بھی معدوم ہونے کا اطلاق کیا گیا۔ اس کی بنا اسی قاعدہ پر تو ہے، کہ اعلیٰ کے سامنے ادنیٰ کو، اور شریف کے سامنے خسیس کو، موجود ہی نہیں کہا جاتا۔ اب بہت آسانی سے سمجھ میں آجائے گا کہ علمِ اعلیٰ واشرف کے سامنے علمِ ادنیٰ واخس کو اگر معدوم بھی کہہ دیا جائے تو کچھ بے جا نہیں۔ اب ہم کہتے ہیں کہ تمام علوم میں اشرف علم دین ہی ہے، اور دیگر تمام علوم اخس اور اسفل ہیں۔ رہی یہ بات کہ یہ فیصلہ کیونکر ہو کہ یہ دعویٰ ہمارا صحیح ہے یا غلط

---

[1] جوتے سینا [2] موچی

اور علوم میں شریف اور خسیس کون ہے، اس کے لئے کوئی معیار ہونا چاہیئے۔ سو اس معیار کی تعیین بہت سہل ہے۔

وہ معیار یہ ہے کہ علم کا شرف، معلوم کے شرف پر موقوف ہے۔ اور معلوم اس کو کہتے ہیں جس کے حالات اس علم میں بیان کئے جاتے ہیں، اور ہر علم کا معلوم جدا ہوتا ہے۔ جس علم کا معلوم جس درجہ میں ہے اسی درجہ میں علم بھی ہوتا ہے۔ مثلاً علم فلاحت کا معلوم "زراعت" یعنی کھیتی کرنا ہے اور کناسی[1] کا معلوم "پاخانہ" ہے جو نسبت دونوں معلوموں میں ہے یعنی کھیتی اور پاخانہ میں وہی نسبت ان کے علموں میں بھی ہو گی۔ ظاہر ہے کہ پاخانہ نجس چیز اور ارذل چیز ہے، اور زراعت صاف ستھری اور ذی شرف چیز ہے، لہٰذا علم کناسی ارذل ہوگا اور علم فلاحت اشرف۔ اور علم کناسی، علم فلاحت کے سامنے علم کہلانے کا بھی مستحق نہ ہوگا۔ یہ قاعدہ تمام علوم کے لئے عام ہے، تفصیل کی ضرورت نہیں۔

اب دیکھئے! علمِ دین کا معلوم کیا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ وہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات اور احکام ہیں۔ تمام علمِ دین کا خلاصہ یہی ہے۔ اور دیگر تمام علوم کا معلوم دنیا کو کہو، یا ماسوی اللہ کو کہو تو جو نسبت دنیا، یا ماسوا کو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے وہی نسبت علوم دنیویہ کو ہوگی علم دین کے ساتھ۔ اور اس نسبت کے متعلق بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے۔

ع: چہ نسبت خاک را با عالم پاک

حق تعالیٰ کی ذات وصفات کو تو کسی چیز کے ساتھ کچھ بھی نسبت نہیں دی جا سکتی۔ وہ باقی اور سب فانی، وہ زندہ، اور سب مُردہ، وہ غنی، اور سب محتاج، وہ موجود، اور سب چیزیں معدوم کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (القرآن) غرض دونوں چیزوں میں کوئی نسبت قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ تو دونوں کے علوم میں بھی کوئی نسبت نہیں قرار دی جا سکتی، سوائے اس کے کہ علم دین پر موجود کا اطلاق کیا جائے، اور دیگر علوم پر معدوم کا۔

اب میرا دعویٰ بہت قریب الی الفہم ہو گیا ہوگا، کہ علم دین کے سامنے دیگر علوم

---

[1] خاک روبی

"علم" کہلانے ہی کے مستحق نہیں۔ مقابلہ تو کیا کیا جائے۔ جو لوگ علم کی فضیلتوں کے ضمن میں علوم دنیا کو ٹھونستے ہیں، مجھے اس پر سخت حیرت ہوتی ہے۔ خدارا مسلمانو! اس اصطلاح کو بدلو، علوم دنیا کو علم مت کہو۔ فن کہو، پیشہ کہو، حرفت کہو، مگر علم مت کہو۔ بلکہ جہاں کہیں قرآن وحدیث میں علم کا لفظ آوے اس سے مراد یہ علوم دنیا ہرگز نہ لو۔

اس میں ایک باریک بات اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب ان دنیوی چیزوں کے علم کو بھی علم کہا جاتا ہے، تو جو لوگ ان علوم کے جاننے والے ہیں ان کو علماء، فضلا، حکماء، عقلا، اہل تحقیق، اور جلنے کیا کیا بھی کہا جاتا ہے۔ اور جب علماء کے فضائل بیان ہوتے ہیں تو ان لوگوں کو بھی ان کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ بعضے لوگ صرف انہیں علوم کو، علوم فاضلہ، مطلوبہ سمجھنے لگتے ہیں۔ کیونکہ علم کے مصادیق ان کے ذہن میں یہی ہیں۔ پھر شرعی نصوص سے ان کی فضیلت ثابت کی جاتی ہے، اور ان علوم کے نہ جاننے والوں کو جاہل، پست ہمت، تاریک دماغ وغیرہ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ جہاں شریعت میں علم کی فضیلت آئی ہے وہاں ان علوم کی فضیلت مراد نہیں، جیسا ابھی بیان ہوا ہے۔ یہ خرابی اس اصطلاح ہی کی ہے اس کو بدلو۔ چنانچہ ایک لیکچر میں دنیوی علوم کی فضیلت کو بیان کیا گیا، اور عجیب طرح استدلال کیا گیا۔ وہ جو عوام کی زبان پر ایک مشہور حدیث ہے اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ (الحدیث) یعنی "علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں ملے"۔ اس میں آجکل کے عام تعلیمیافتہ لوگ تو علوم مروجہ کو صرف داخل ہی کیا کرتے ہیں، لیکن اس لیکچرار نے تو اور بھی کمال کیا کہ اس نے اس حدیث میں صرف ان ہی علوم کو مراد لیا، اور دلیل یہ بیان کی کہ یہ حدیث جس وقت ارشاد ہوئی اس وقت چین میں ظاہر ہے کہ علوم دین تو پہنچے ہی نہیں تھے، صرف علوم دنیویہ ہی تھے تو لامحالہ اس جملہ میں علم سے مراد صرف یہی دنیویہ علوم ہوں گے۔ بظاہر یہ ایسا استدلال ہے کہ آجکل کے تعلیم یافتہ تو اس پر عش عش کرنے لگیں گے، اور اپنے نزدیک سمجھ لیں گے کہ بس اس کا کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا۔

لیکن سنیے! عربی زبان کے محاورات میں لو کا لفظ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جہاں ہمارے محاورہ میں بالفرض کا لفظ بولا جاتا ہے مثلاً آیت میں ہے "لَنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ..... (القرآن) یہ آیت کفار کے بارے میں ہے مطلب یہ ہے کہ کافر سے اس کے جرم کے فدیہ میں تمام زمین بھر کر سونا بھی نہیں قبول کیا جائے گا، اگرچہ وہ دینا چاہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قیامت میں ایسا ہوگا کہ کافر زمین بھر کر سونا دے گا مگر قبول نہ کیا جائے گا۔ بلکہ یہی مطلب ہے کہ ایسا نہ ہوگا اور اگر بالفرض ایسا ہوتا بھی تب بھی قبول نہ کیا جاتا۔ اور کافر کو دوزخ ہی میں ڈالا جاتا۔ بنا بریں "وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ" والی حدیث میں جو لفظ علم واقع ہے اس سے یقیناً علوم دنیویہ مراد نہیں ہو سکتے وہ تو اس وقت وہاں موجود تھے، بلکہ ایسا علم مراد ہوگا جو اس وقت وہاں نہ تھا، اور اس کا ہونا بعید بھی تھا۔ سو حاصل حدیث کا یہ ہوا کہ علم دین جس کی توقع چین میں ہونا بہت بعید ہے۔ اگر بالفرض کسی وقت وہاں مل سکے تو وہاں جاکر حاصل کرنا۔ اب بتلائیے اس حدیث میں علم سے مراد علم دنیوی ہوا یا علم دین؟

غرض! یہ خلطِ اصطلاح ہے، کہ علم سے مراد ہم جو چاہیں لے لیں۔ اور نصوص شرعیہ میں جو فضیلت علم کی آئی ہے وہ اپنے اصطلاحی معنوں کے لئے ثابت کریں۔ شاید کوئی ذہین آدمی یہ کہے کہ مشہور جملہ ہے "لامشاحۃ فی الاصطلاح" کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ ایک اصطلاح میں ان علوم کو بھی علم ہی کہتے ہیں تو اس پر کیوں نکیر کی جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اختیار آپ کو بے شک حاصل ہے، اور کوئی آپ کو منع نہیں کر سکتا کہ آدمی کا نام بندر رکھ دیجئے، یا خنزیر رکھ دیجئے۔ لیکن آپ کو اپنی اصطلاح کا دوسرے علوم، یا فنون میں جاری کرنے کا تو اختیار نہیں ہے، وہاں تو اسی علم، یا فن کی اصطلاح لی جائے گی۔ اور یہ اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ شریعت کی اصطلاح میں "علم" صرف علم دین ہی ہے۔ تو آپ کو اپنی اصطلاح اختراع کر کے شریعت میں تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں۔ لہٰذا آپ کو وہ فضائل جو شریعت نے علم کے واسطے بیان فرمائے ہیں، علوم دینیہ ہی کے واسطے

ماننے پڑیں گے، دوسرے علوم کے لئے نہیں۔

البتہ علوم دنیویہ کے متعلق شریعت کا حکم یہ ہے کہ نہ یہ منع ہیں، اور نہ کچھ فضیلت کی چیز ہیں، ہاں ان کے لئے بھی شریعت کے احکام ہیں، اور قیود ہیں، جو اپنے اپنے موقع پر مذکور ہیں۔ نہ انگریزی پڑھنے کو منع کیا جاتا ہے، نہ زراعت کو، نہ تجارت کو، ہاں! ان کو منتہائے مقصود، اور جزو شریعت، بنانے سے منع کیا جاتا ہے۔

دیکھئے! پڑوسی کے بھی حقوق ہوتے ہیں، جن کو سب دنیا مانتی ہے، شریعت نے بھی پڑوسی کے بہت حقوق مقرر کئے ہیں، لیکن اسبات کو کوئی عقلمند جائز نہیں رکھتا، اور نہ شریعت یہ تعلیم دیتی ہے کہ اس کو باپ بنالو، یا اس کو میراث دو۔ ہاں! یہ حکم ضرور ہے کہ اس کا ہر بات میں جائز لحاظ کرو، اور قدر کرو، اس کو احتیاج ہو تو اس کی امداد کرو، لیکن اسی حد میں رکھو جو پڑوس کے لئے مناسب ہے۔ ذِی الْقُرْبیٰ پر مقدم نہ کرو۔ اسی طرح تمام ان چیزوں کو جو مفید ہیں سیکھنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ حدود کے اندر ہوں۔ لیکن ان کو کوئی امرِ شرعی، یا فضیلت، اور جزو دین مت کہو۔ ورنہ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے پڑوسی کو باپ بنانا۔

اب میں اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ قلب کے لئے دو صفت ہیں۔ اگر ان دونوں کے ساتھ متصف ہو کر قلب میں موجود ہو تو "لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ" کا مصداق ہوگا۔ ان میں سے ایک صفت تو علم ہے جس کا علمِ دین کے ساتھ خاص ہونا اوپر ثابت ہو چکا ہے، اور دوسری صفت عزم ہے، اور جیسے کہ علم کے معنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں جس کو رفع کر دیا گیا ہے، ویسے ہی عزم کے معنی میں بھی لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کہ ارادۂ ضعیفہ کو بھی عزم سمجھتے ہیں، خواہ وہ ادنیٰ مانع سے بھی زائل ہو جائے۔ اس لئے اس غلطی کو بھی میں رفع کرتا ہوں۔ بیان اس کا یہ ہے کہ عزم کہتے ہیں ارادۂ قویہ کو یعنی ایسا پختہ ارادہ ہو کہ چاہے کیسا ہی عارض پیش آجائے (بشرطیکہ اختیار باقی رہے) اس ارادہ میں زوال نہ ہو۔ تو انتفاع بالقرآن کے لئے دو شرطیں ہوئیں، ایک یہ کہ دین کا علم ہو،

اور دوسری یہ کہ اس پر عمل کرنے کا پختہ قصد ہو۔ اور یہی حاصل ہے "لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ" کا۔ غرض! اس آیت کا یہ مطلب ہوا کہ نفع اس شخص کو ہوگا۔ جس کو علم دین حاصل ہو، اور اس پر عمل کے لئے عزم ہو۔ مجھے اس وقت اسی کا بیان کرنا ہے کہ ہر مسلمان کو ان دونوں صفتوں کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے، علم دین کی، عزم کی، علم سے سیدھا راستہ معلوم ہوگا، اور عزم سے اس راستہ پر چلنا نصیب ہو سکے گا۔

سبحان اللہ! یہ کس قدر مختصر تعلیم ہے۔ اس کی قدر اہل فہم جان سکتے ہیں کہ کسقدر مختصر عنوان ہے، اور جامع ہے۔ یہ بھی حکمت کا اصول ہے کہ دستور العمل مختصر ہو، کیونکہ دستور العمل جس قدر مختصر ہو اس میں عمل کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت حدیثوں سے بھی ملتا ہے۔ ایک اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور کہا کہ "مجھے کچھ تعلیم کیجئے! مگر وہ تعلیم مختصر ہو"۔ حضور نبی تھے! کیسی جامع اور مختصر تعلیم فرمائی۔ فرمایا! "قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ"۔ یعنی اللہ پر ایمان لا پھر اس پر جمارہ کیسا چھوٹا سا جملہ ہے مگر اس میں سب ہی کچھ آگیا۔ یہ ایسا ہے جیسے نکاح کے وقت ایجاب اور قبول کیا جاتا ہے، اور لڑکے سے کہا جاتا ہے کہ تم نے فلاں لڑکی سے نکاح کو قبول کیا، وہ کہتا ہے قبول کیا۔ یہ ذرا سا لفظ ہے، مگر تمام ذمہ داریاں، اور حقوق معاشرت سب کو حاوی ہے۔ ایسے ہی جب کہا کہ اللہ پر ایمان لا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ حق تعالیٰ کو خدا اور اپنے آپ کو بندہ مان لے۔ اس میں سارے حقوق الوہیت، حقوق عبودیت، آگئے۔ اور دوسرے جملہ میں ہے "ثُمَّ اسْتَقِمْ"، یعنی اس پر جمے رہو۔ حاصل یہ ہوا کہ ایمان لاؤ اور مرتے دم تک مومن رہو۔ بس دیکھو! جیسا اس کا سوال تھا ویسا ہی جواب ہوگیا۔ یہ اعلیٰ درجہ کی حکمت ہے کہ دستور العمل مختصر ہو، اس سے احکام مختصر نہیں ہو جاتے ہاں یادداشت مختصر ہو جاتی ہے۔ اس سے دماغ پریشان نہیں ہوتا، اور ہر وقت تمام اجزاء اس دستور العمل کے اس عنوان کی وجہ سے مستحضر رہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک استاد نے بچہ کو

آمد نامہ پڑھایا، اور ایک ہزار مصدر یاد کرا دیئے۔ اب ان ہزار مصدروں کو یاد رکھنے میں اس کو بہت دقت ہوگی۔ اس کے لئے اس نے مصدر کی ایک علامت کلی بتلا دی کہ جس لفظ کے آخر میں دَنْ یا تَنْ ہو وہ مصدر ہوتا ہے۔ اس سے اس کو کس قدر سہولت ہوگئی، اور کتنا بار ہلکا ہوگیا۔ اگر یہ علامت نہ بتلائی ہوتی تو ان مصدروں کے یاد رکھنے کے لئے اس کو کس قدر تعب اٹھانا پڑتا۔ کہ ہمیشہ ان مصدروں کو بطور آموختہ کے پھیرا کرتا۔ اور اس علامت کے بتلا دینے کے بعد اسے آموختہ کی ضرورت ہی نہیں، ہر مصدر کو غیر مصدر سے تمیز کر سکتا ہے۔ (کوئی طالب علم یہ سوال نہ کر بیٹھیں کہ اس علامت سے گردن بھی مصدر ہوا؟ کیونکہ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ آخر میں دَنْ یا تَنْ ہونے کے ساتھ اس سے صیغے بھی مشتق ہوتے ہوں۔ یہ بحثیں اپنے موقعوں پر کتابوں میں مذکور ہیں۔ یہاں ایک مثال کے طور پر ذکر آگیا تھا) اس علامت سے مصادر مختصر نہیں ہو گئے، مصادر تو ہزار ہا تھے اور وہ ہی ہے ہاں یادداشت مختصر ہوگئی۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔ ثُمَّ اسْتَقِمْ یعنی ایمان پر مع اس کے کل لوازم کے جمے رہو۔ اس میں کل احکام شریعت کے آگئے۔ اور ذہن میں جمعیت پیدا ہوگئی۔

اس کی قدر اس اعرابی ہی سے پوچھنا چاہیئے ایک بڑی چیز ہاتھ آگئی، اور جس چیز کی اس کو تلاش تھی وہی مل گئی۔ ہم اپنے محاورات میں دیکھتے ہیں کہ جب ہم کوئی نوکر رکھتے ہیں تو اس سے بہت سے کام لیتے ہیں۔ سب کاموں کو ایک دم بتا دینا ناممکن ہے، اس واسطے خلاصہ بتا دیا جاتا ہے کہ حاضر رہو، اور جس وقت ہم گھنٹی بجائیں فوراً بولو، اس کہہ دینے کے بعد کاموں کی تفصیل کی ضرورت نہیں رہتی، اس کو ضابطہ کہتے ہیں اور اسی کا ترجمہ قاعدہ کلیہ ہے۔ ہر کام میں ضابطہ سے آسانی ہوجاتی ہے۔ اسی طرح قرآن سے نفع ہونے کے لئے ضابطہ بتلا دیا گیا، جس کے بعد تفصیل یاد رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ وہ ضابطہ یہی ہے "لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ" اور اس کے دو جزو ہوئے علم اور عزم یعنی ہمت۔

دین مکمل موجود ہے، اس کے علم کی ضرورت ہے، اور نرا علم کارآمد نہیں ہوتا، بلکہ اصل غرض عمل ہے۔ اس کے لئے عزم و ہمت کی ضرورت ہے۔ دین کے بہت سے اجزا ہیں، عنوان مختصر ہونے سے ان اجزار کی کمی مقصود نہیں بلکہ ان کے یاد رکھنے میں سہولت مقصود ہے۔ آجکل یہ بھی ایک ہوا چلی ہے کہ دین کا اختصار کیا جاتا ہے جیسے محسوسات میں "علم کیمیا" نکل آیا ہے کہ اس سے ہر چیز کا جوہر نکال لیا جاتا ہے۔ دواؤں کے جوہر موجود ہیں۔ جو دوا سیر بھر وزن سے کام دیتی تھی، وہ اب ماشہ بھر سے کام دیتی ہے غرض! صنائع کی ترقی ہے، اس سے ہر چیز کا اختصار کر لیا گیا ہے جو کام دس آدمی کرتے تھے وہ ایک آدمی مشین سے کر سکتا ہے، جو مسافت دس دن میں طے ہوتی تھی وہ ریل سے، یا موٹر سے دس گھنٹہ میں طے ہوتی ہے۔ بعض غذاؤں کے جوہر بھی نکالے گئے ہیں جن سے جو کام سیر بھر غذا سے نکلتا تھا وہ چھٹانک بھر جوہر سے نکل آتا ہے۔ بعض ذہین لوگوں نے "علم کیمیا" کو دین میں بھی استعمال کیا ہے جس سے دین کا بھی اختصار کرنا چاہا ہے۔ گویا تھوڑے کام سے سارے دین کا کام لے سکتے ہیں جیسے تھوڑی دوا سے بہت سی دوا کا کام لیا جاتا ہے۔ اب دین کا جوہر کیا رہ گیا ہے؟ فقط الٹی سیدھی نماز پڑھ لینا اور کسی رفاہِ عام کے کام میں چندہ دے دینا۔ اس کو بجائے زکوٰۃ کے سمجھتے ہیں، اور یورپ کا سفر کر آنا یہ حج کا خلاصہ ہے، بعض نے تو یہاں تک اختصار کیا ہے کہ نماز کے لئے وضو کی بھی ضرورت نہیں رکھی، اور رکعتوں کی تعداد بھی اڑا دی، اور اس سے بھی زیادہ اختصار یہ کیا ہے کہ تمام دین سے مقصود نیکی کرنا ہے۔ بس نیکی کرتے رہو، کسی کو ستاؤ مت، یہی دین ہے، یہ سب دین کے جوہر ہیں۔

صاحبو! دین خود جوہر ہے۔ جوہر کے جوہر نکالنے کے کوئی معنی نہیں۔ اگر کسی دوا کا جوہر نکالا تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کا بھی جوہر نکالو پھر اس جوہر کا بھی جوہر نکالو۔ اس کا انجام تو اس چیز کو فنا کر دینا ہے۔ علم کیمیا کا انکار نہیں، مگر تحلیل زوائد کی ہوا کرتی ہے۔ ایک دوا

کا جوہر نکالتے ہیں تو اس کے یہ معنے ہیں کہ جو چیزیں اس میں زائد تھیں ان کو تدبیر سے تحلیل کر دیا اور اصل چیز رہ گئی اسی کا نام جوہر ہے، اور اسی کو سب بھی کہتے ہیں۔ اب ست چونکہ اصل چیز ہے اور زوائد سے پاک ہو چکا ہے اب اس میں تحلیل نہیں ہو سکتی۔

دین سارے کا سارا جوہر اور ست ہی ہے۔ جن اجزاء کو زواید کہا جاتا ہے وہ زوائد نہیں، اگر وہ زوائد ہوتے تو ان کے ترک پر وعید کیوں ہوتی؟ رہے مکررات مثلاً نماز میں چار رکعت ہیں، سو یہ سمجھنا کہ ایک رکعت کافی تھی، بار بار چار دفعہ ایک ہی سے افعال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دیکھئے! آپ کا جسم کتنے اعضاء سے مرکب ہے جن میں مکررات بھی ہیں۔ دو ہاتھ ہیں، دو پیر ہیں، دو آنکھیں ہیں، وغیرہ وغیرہ مگر ان میں چونکہ زوائد نہیں ہیں بلکہ یہ سارے کے سارے اصلی اور ضروری اجزاء ہیں، گویا ست ہی ہیں اس واسطے ان میں تحلیل و تخفیف نہیں کی جاتی، ورنہ ان میں بھی اختصار کیجئے۔ دو ہاتھ کی جگہ ایک ہاتھ رکھیئے دو پیر کی جگہ ایک پیر رکھیئے۔ دو آنکھوں کی جگہ ایک آنکھ رکھیئے۔ منہ میں دانت تو ۳۲ ہیں ان میں اختصار کر کے صرف ایک دانت رکھیئے باقی زوائد کو حذف کیجئے اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ جو اعضاء دو ہیں دونوں کی ضرورت ہے۔ دانت ۳۲ ہیں تو ۳۲ ہی کی ضرورت ہے، اگر اتنے نہ ہوں تو کام نہیں چلے گا؛ دو ہاتھ نہ ہوں تو کھانا، پینا، آبدست لینا دشوار ہو گا، دانت ۳۲ نہ ہوں تو کھانا مشکل ہو گا۔ پیر دو نہ ہوں تو چلنا پھرنا ناممکن ہے۔

اب سمجھئے! کہ جو اعضاء کے اختصار پر مضار مترتب ہیں یہ وعیدیں ہی تو ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ اگر اختصار ہو گا تو فلاں نقصان ہو گا۔ دین آخرت کا کام ہے اس کے اجزاء کی کمی پر وعیدیں موجود ہیں کہ اگر فلاں کام نہ ہو گا تو اس پر یہ عذاب ہو گا۔ پھر اس میں اختصار کے کیا معنی؟ اس میں اختصار کے یہی معنی تو ہوئے کہ گو یہ عذاب ہو مگر ہم اس کو برداشت کریں گے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے جسم کے اجزاء کے بارہ میں کہیں کہ اگر ایک پیر

ہو گا تو بلا سے ہم چلنا پھرنا نہیں کریں گے، ایک ہاتھ ہو گا تو ہم آبدست نہیں لیں گے پھر کسی کو یہ کرتے دیکھا ہے، یا کوئی اس کو پسند کرتا ہے۔ اگر دین کا ست نکالنا اور اختصار کرنا ہے تو اپنے جسم کا بھی ست نکالئے اور اعضاء میں اختصار کیجئے۔ مگر اعضاء کی نسبت تو کہا جاتا ہے کہ ایک بھی زائد نہیں، بلکہ بعضے اعضاء ایسے ہیں جن کی ضرورت اور حکمت اب تک سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ "صانع" جل شانہٗ علیم و حکیم ہے ان میں بھی کوئی حکمت نہ رکھی ہو گی "فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ"، حیرت ہے کہ جسم کے اجزاء میں تو حکمت اور دین کے اجزاء میں حکمت نہ ہو حالانکہ دین بھی تو انہیں کا بنایا ہوا ہے جن کا جسم بنایا ہوا ہے، جو علیم و حکیم ہیں اور جسم دنیاوی چیز ہے، جس کو انہوں نے خود ناقص اور ناقابل اعتبار کہا ہے، اور جو فانی بھی ہے۔ اور دین اُخروی چیز ہے جس پر آخرت مترتب ہے۔ اور آخرت کو کامل، اور قابل اعتبار کہا ہے، اور وہ باقی ہے۔ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ القرآن پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو چیز فانی، اور ناقابل اعتبار ہو، اس کے اجزاء میں تو حکمت ہو، اور جس پر ایک خیر باقی مرتب ہو اس کے اجزاء میں حکمت نہ ہو، یہ بہت موٹی بات ہے۔

میں تو کہتا ہوں کہ دین کا کوئی جزو بھی زائد نہیں۔ حتیٰ کہ مستحبات بھی اپنے درجہ میں غیر زائد ہیں گو اتنا تفاوت ہے کہ واجبات کی کمی میں خسران ہے اور مستحبات کی کمی میں حرمان، مگر ضرر تو ان کی کمی میں بھی ہوا اب لوگ مستحبات کو یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ کوئی ضروری کام نہیں، کریں گے تو ثواب ملے گا، نہ کریں گے تو گناہ نہ ہو گا۔ صاحبو! گناہ نہ ہونا اور بات ہے اور منفعت ہونا اور بات! اگر آپ کو مستحبات کے ثمرات معلوم ہو جائیں تو ان کا بھی کافی اہتمام کرنے لگیں۔ اگر مستحبات کے ثمرات سامنے آجائیں تو کوئی ایک ادنیٰ سے مستحب کو بھی نہ چھوڑیں گے، گو یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ مستحبات سے ضرورت کو اٹھالیا، اس وجہ سے کہ ہم لوگوں میں ہمت کم ہے۔ اگر سب کو فرض کر دیا جاتا تو غالباً ہم مستحبات ہی کو نہیں بلکہ فرائض کو بھی چھوڑ دیتے۔ اور یہ فرق علوم دینیہ کی تکمیل کے لئے

ظاہر کیا گیا ہے۔

حق تعالیٰ علماء کو جزائے خیر دے، جنہوں نے احکام دین کے مراتب کو خود شریعت کے اشارات سے سمجھ کر قائم کیا۔ اور یہ منجانب اللہ دین کی حفاظت ہے کہ ایسے وقت میں یہ ترتیب ہوگئی جبکہ دین میں کچھ گڑبڑ بھی نہیں ہونے پائی تھی۔ اگر اس وقت علماء دین کو بلاترتیب چھوڑ دیتے، تو اس وقت میں جبکہ ہوے اور رائے کا دور دورہ ہے دین میں غلط مبحث ہو جاتا۔ اور اس کے کسی جزو کا بھی پتہ نہ چلتا۔ الحمد للہ! کہ اب دین کی ایسی ترتیب ہوگئی کہ تمام احکام کے مراتب محفوظ ہیں۔ فرائض الگ ہیں، سنن الگ ہیں، مستحبات الگ ہیں۔ جس کی علت اور حکمت وہ ہے جو ابھی مذکور ہوئی۔ مگر ہم لوگوں نے اس کا نتیجہ الٹا نکالا کہ مستحبات کو زوائد سمجھ لیا اور ان کا اہتمام بالکل چھوڑ دیا۔ یہ مانا کہ ضرورت کو ان سے اٹھا لیا گیا ہے، مگر جو ثمرات اور درجات ان پر موعود ہیں وہ بھی تو بلا ان کے نہیں ملیں گے، اور وہ ثمرات معمولی چیزیں نہیں ہیں۔ دیکھئے! کوئی اعلان کرتا ہے کہ جو کوئی صبح کو میرے مکان پر پہنچ جائے گا اس کو ایک لاکھ روپیہ ملے گا، یہ اعلان امر اور وجوب کے درجہ میں نہیں ہے، انعام اور بخشش کے درجہ میں ہے، جس کو زائد ہی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہے کوئی ایسا جو اس اعلان کو سن کر وہاں پہنچ نہ جائے؟ ایک لاکھ روپیہ تو بڑی چیز ہے، ایک روپیہ کا بھی اعلان ہو، بلکہ دو لڈوؤں کا بھی اعلان ہو تب بھی وقت مقررہ سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے غیر اس اعلان میں تو یقین یا کم از کم ظن غالب ہوتا ہے شے موعود کے مل جانے کا اور رجوئے میں تو یقین، بلکہ ظن بھی نہیں ہوتا۔ صرف امید موہوم پر ہزاروں روپیہ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اس احتمال پر کہ شاید! ہم ہی جیت جائیں پھر جس پر یقین ہو ایسے ثمرات کے ملنے کا جو دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں اس پر کیا ہونا چاہیئے۔

مستحبات کی مثال احکام کے اندر ایسی ہے جیسے دعوت کے کھانوں میں چٹنی، کہ چٹنی کسی معنی کر زائد ہی ہے، نہ اس پر بقائے حیات موقوف ہے، اور نہ پیٹ بھرنا موقوف

ہے، پھر دیکھئے چٹنی کا بھی کتنا اہتمام ہوتا ہے کہ فرمائش کرکر کے چٹنی منگائی جاتی ہے اور صرف ایک ہی قسم کی چٹنی سے سیری نہیں ہوتی۔ بلکہ طرح طرح کی چٹنیوں اور اچاروں کا مطالبہ ہوتا ہے، اور بلا چٹنی کے دعوت پھیکی کہی جاتی ہے۔ اسی طرح صرف فرائض و موکدات ادا کر لینے سے ضرورت کا مرتبہ تو پورا ہو جائے گا، اور آخرت میں عذاب بھی نہ ہوگا۔ لیکن بلا مستحبات کے جنت سونی سونی رہے گی۔ اس کی جنت کا حصہ دوسروں کے حصے کی نسبت ایسا رہے گا جیسا کم درختوں کا باغ زیادہ درختوں والے باغ کے سامنے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام ہے جو شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت پہنچایا گیا ہے اَلْجَنَّۃُ قِیْعَانٌ وَغِرَاسُھَا سُبْحَانَ اللّٰہِ۔" یعنی فرما دیجئے گا اپنی امت سے کہ "جنت چٹیل میدان ہے اور اس میں درخت لگانے کی ترکیب یہ ہے کہ سبحان اللہ پڑھا جائے۔" یہ بات حدیث سے ثابت ہے کہ "اگر ایک دفعہ بھی کوئی سبحان اللہ کہتا ہے تو اس کے لئے فوراً ایک درخت جنت میں لگ جاتا ہے۔"

دیکھئے ظاہر میں یہ کوئی ایسی ضروری بات نہ تھی جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہم لوگوں تک پہنچایا۔ بات یہ ہے کہ وہ حضرات رحیم وکریم ہیں خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام انہوں نے ہم کو ایسی تدبیر بتا دی جس سے جنت کے زیادہ درخت مل جاویں۔ اس میں یہ تعلیم بھی ہو گئی کہ فرائض پر بس مت کر لینا آگے بھی ہمت کرنا۔ غرض مستحبات بھی اہتمام کے قابل چیزیں ہیں، زوائد نہیں ہیں۔ جبکہ مستحبات بھی زوائد نہیں ہیں تو فرائض و واجبات کا تو کیا پوچھنا ہے۔ پھر دین میں اختصار کیسے ہو سکتا ہے۔

بیان یہ تھا کہ "لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ" عنوان مختصر ہے اس سے دین کے اجزاء میں اختصار لازم نہیں آتا۔ تفصیلات تو سب کی سب بدستور رہتی ہیں۔ عنوان مختصر سے صرف یادداشت میں سہولت ہو جاتی ہے، اور یہ عین حکمت ورحمت ہے۔ یہاں سے اس حدیث کا حل بھی ہو جاتا ہے مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ اس سے بعض فاسد

دماغ لوگوں نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ بس توحید کا قائل ہونا نجات کے لئے کافی ہے۔ رسالت کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ حدیث میں تو صرف اتنا ہی آیا ہے۔ "مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" یہ حل اس طرح ہوا کہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" عنوان ہے دین کا جو حاوی ہے تمام اجزائے دین کو گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ "جو کوئی دین اسلام قبول کرے وہ جنت میں جائے گا"۔ اور دین میں تمام اجزاءِ دین آ گئے۔ ان کی تفصیل دوسری نصوص میں صراحۃً موجود ہے مثلاً کُلٌّ "اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ"۔ اس میں اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ ملائکہ پر، اور کتب سماویہ پر، اور تمام انبیاء پر ایمان لانا مذکور ہے اس طرح کی صدہا آیتیں ہیں۔ جن میں اجزاءِ دین کا بیان ہے۔ تو کیا یہ حدیث ان آیات کی معارض ہے؟ حاشا وکلا! حقیقت یہی ہے کہ یہ محض عنوان ہے، مراد تمام اجزاءِ دین ہیں۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ توحید کو ماننا مستلزم ہے رسالت کے ماننے کو بھی۔ کیونکہ توحید کو ماننا مستلزم ہے اس بات کو کہ حق تعالیٰ کو سچا مانا جائے اور حق تعالیٰ کے کلام میں موجود ہے "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" تو جو شخص رسالت کو نہیں مانتا وہ حق تعالیٰ کی تکذیب کرتا ہے جب تکذیب کی تو اس پر "مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کہاں صادق ہوا۔ غرض یہ محض جہالت اور کوتاہ نظری ہے کہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کو صرف اس کے لفظی معنی پر محمول کیا جائے۔ بلکہ یہ تو ایک جامع مانع عنوان ہے جو تمام دین کو شامل ہے۔ اس کی ایک بہت موٹی مثال وہی ہے جو قریب ہی بیان ہوئی ہے، یعنی نکاح جو کیا جاتا ہے وہ ظاہر میں تو نام ہے صرف ایجاب وقبول کا، لیکن یہ ایجاب وقبول، نکاح کا محض عنوان ہے۔ اور درحقیقت ان کے اندر تمام دنیا کے بکھیڑے، مصائب، اور مصارف سب داخل ہیں جو نکاح کے بعد پیش آتے ہیں۔

فرض کیجئے کسی نے نکاح کیا، پھر چند روز کے بعد بی بی صاحبہ نے نان، نفقہ کا مطالبہ اور آٹے، دال کا تقاضا کیا، اور رہنے کو گھر مانگا، تو کیا دولہے میاں یہ کہہ سکتے ہیں

کہ واہ میں نے تو تمہیں قبول کیا تھا، اس آٹے، دال، اور گھر گھرستی، کا دینا کب قبول کیا تھا۔ اگر کوئی ایسا کہے بھی تو اس پر سب ہنسیں گے، اور اس کو بے وقوف بنائیں گے، اور اس کو یہی جواب دیں گے کہ "میاں تم نے جو نکاح میں یہ کہا تھا کہ میں نے تجھ کو قبول کیا، اس میں سب کچھ آگیا۔ نان نفقہ بھی، گھر گھرستی بھی، نمک، تیل، لکڑی بھی"۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ نکاح ایک عنوان ہے جو خود تو مختصر ہے لیکن بہت سے بکھیڑوں کو شامل ہے۔ بس اسی طرح مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے۔ کہ وہ ایک مختصر عنوان ہے جو تمام اجزائے دین کو شامل ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج معاملات، معاشرات، اخلاق، فرائض، مستحبات کو بھی۔ ہاں ان مختلف اجزائے دین میں فرق مراتب ہونا اور بات ہے۔

پس لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا خلاصہ حق تعالیٰ سے تعلق ہو جانا ہے۔ جب یہ ہوگیا تو پھر جو کچھ بھی حق تعالیٰ فرمائیں گے وہ سب کرنا پڑے گا، جیسے نکاح کا خلاصہ ہے بی بی سے تعلق ہو جانا، جب نکاح ہوگیا تو پھر جو کچھ وہ اپنے حقوق واجبہ طلب کرے گی وہ دینا پڑیں گے۔ بلکہ نکاح کا تعلق تو محدود ہے، اور وہ قطع بھی ہو سکتا ہے، لیکن حق تعالیٰ کا تعلق غیر محدود ہے، اور وہ قطع بھی نہیں ہو سکتا بس لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا اور ہمیشہ کے لئے پھنس گئے، اور سارے حقوق الوہیت سر پڑ گئے۔ کہیں اس فقرہ کو سن کر کہ "پھنس گئے" وحشت نہ کرنے لگنا۔ کیونکہ حق تعالیٰ سے تعلق تو ایسا لذیذ ہے کہ اس میں پھنس جانے کے بعد پھر رہائی کی تمنا ہی نہیں رہتی۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ ؎

اسیرش نخواہد رہائی ز بند شکارش نجوید خلاص از کمند

وحشت بس جب ہی تک ہے جب تک اس میں پھنسے نہیں ہو اور جب پھنس گئے تو بس پھر ساری دنیا اس قید کے مقابل بُری معلوم ہونے لگے گی۔ سوائے اس قید کے کوئی چیز اچھی ہی نہ معلوم ہوگی۔ دیکھئے! وہ لوگ جو اسلام لانے سے پہلے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن اور خون کے پیاسے تھے. جن کی سرشت میں گویا جہالت، اور عداوت داخل تھی، بس ایک دفعہ کلمہ پڑھنے کے بعد ہی حضورؐ پر دل وجان سے فدا ہونے لگے اور حضورؐ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون گرانے کی بخوشی تیار ہو گئے۔ چنانچہ نہایت شوق کے ساتھ جہاد کئے، سر کٹوائے، شہید ہوئے، آخر یہ بھی کہیں سُنا کہ ان میں سے کوئی ان تکلیفوں کے وقت اسلام سے پھر گیا ہو، یا دل پر کبھی میل بھی لایا ہو آخر اس میں کوئی لذت ایسی ہی تو تھی جس کے سامنے ان کی نظر میں دنیا کے سارے عیش اور آرام گرد ہو گئے تھے، اور ساری مصیبتیں آسان ہو گئی تھیں۔ سارے مصائب برداشت کئے لیکن اس جال سے نکلنا گوارا نہ کیا اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم　　غیر زلف آن نگارے دلبرم

اور یہ بالکل سچ ہے ؎

اسیرش نخواہد رہائی زبند　　شکارش نجوید خلاص از کمند

عاشق کو تو جو تکلیف محبوب کی طرف سے پہونچے وہ تکلیف ہی نہیں بلکہ سراسر راحت ہے۔ میں اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں، وہ یہ کہ فرض کیجئے کسی کا کوئی محبوب ہے وہ ایسا ہے کہ عاشق اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے مگر وہ کبھی اس کو منہ بھی نہیں لگاتا اتفاق سے مدتوں حیران و پریشان ہونے کے بعد ایک دفعہ ایسا ہوا کہ اس محبوب نے پیچھے سے آکر اس عاشق کی کولی بھر لی اور اتنی زور سے دبایا کہ میاں کی پسلیاں ٹوٹنے لگیں۔ اب ظاہر ہے کہ اسے اس سے تکلیف تو ضرور ہو گی، لیکن جب پیٹھ پھیر کر دیکھے گا کہ ارے یہ تو میرا محبوب ہے اس وقت اسکی کیا حالت ہو گی ــــــ کیا وہ تکلیف پھر تکلیف رہے گی یا مبدل براحت ہو جائے گی؟ اب فرض کرو کہ وہ محبوب یہ کہے کہ اگر تجھ کو تکلیف ہو رہی ہو اور میرے دبانے سے ناگواری ہو تو میں تجھ کو چھوڑ کر تیرے رقیب کو دبا لوں۔ کیا اس کو وہ منظور کر

لے دلبر چن لیا۔

لے گا؟ ہرگز نہیں وہ تو یہ کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یہ تو وہ تکلیف ہے جس پر ہزار راحتیں قربان۔ اسی طرح اگر تعلق مع اللہ صحیح معنوں میں پیدا ہو گیا ہے تو تمام احکام خداوندی بجالانے میں لذت ہی لذت آئے گی اور کوئی بھی تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ پھنس جانے سے وحشت نہ ہونی چاہیئے۔ وہ صورۃً پھنس جاتا ہے اور حقیقتہً دولت ہی دولت مل جاتی ہے۔ مثال مذکور سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اپنے کو شریعت کے آغوش میں دینا، محبوب کی گود میں دینا ہے اگر آغوش محبوب سے نکلنا پسند ہے تو مبارک ہو شریعت کو بھی چھوڑ دو۔ مگر کیا ایسا ہو سکتا ہے؟

اسی واسطے میں نے کہا تھا کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ کر پھنس گئے تو پھنس گئے جیسے نکاح میں قبلتُ کا لفظ کہہ کر پھنس گئے تو پھنس گئے سارے حقوق نکاح کے اسی قبلت میں آگئے، وہاں ایک محبوب مجازی کے پھندے میں پھنس گئے، یہاں محبوب حقیقی کے پھندے میں پھنس گئے بس لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا کہنا کیا ہوا کہ چاروں طرف سے جکڑ جانا ہوا۔ اب اس خیال کی غلطی سمجھ میں آگئی ہوگی جس میں "مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" سے یہ استنباط کیا تھا کہ "صرف توحید کا قائل ہونا نجات کے لئے کافی ہے"۔ اجی حضرت! توحید تو توحید! اس جال میں پھنس جانے کے بعد تو مستحبات کو بھی نہ چھوڑ سکیں گے۔ اور اس مباح کے پاس بھی نہ جا سکیں گے۔ جس میں ذرا کھٹکا ہوگا کہ شاید محبوب کو ناپسند ہو۔

غرض! یہ سب عنوانات ہیں اور ضابطے ہیں جن سے احکام کم نہیں ہوتے، بلکہ ان کے سمجھنے میں، اور یاد رکھنے میں سہولت ہو جاتی ہے۔ جیسے حضورؐ نے اس اعرابی کو تمام دین کی جان بتادی کہ بس لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر جمے رہو۔ یہ تمام دین کی جان اس لئے ہے کہ توحید پر جمے رہنا اور توحید کی حفاظت تمام حقوق محبوب حقیقی کی حفاظت ہے۔ اس میں تمام دین آگیا، خواہ اصول ہوں، یا فروع اور واجبات ہوں، یا مستحبات، اور اس

کلمۂ توحید کے بعد جو بات بھی دین کی بتلائی جائے گی۔ وہ سب اسی کے اجزاء ہوں گے جیسے ازدواج کے تمام حقوق نکاح ہی کے اجزاء ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس سائل کو تعلیم فرمائی "قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ" اس میں مختصر عنوان سے تمام دین کی تعلیم کر دی پھر فرمایا "ثُمَّ اسْتَقِمْ" یعنی دین کے تمام اجزاء پر جمے رہنا، یہ نبیؐ ہی کی تعلیم ہو سکتی ہے کہ ایسے مختصر جملہ میں سب کچھ تعلیم کر دیا۔

یہ اعرابی کی حکایت میں نے اس واسطے پیش کی کہ کسی کام کا ضابطہ بنا دینے سے اس کے اجزا کے استحضار میں سہولت ہو جاتی ہے، یہ نہیں کہ ان اجزاء میں اختصار ہو جاتا ہے، جیسا اس شخص نے سمجھا جس نے مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے یہ استدلال کیا کہ صرف توحید کا اعتقاد کافی ہے، نہ رسالت کے اعتقاد کی ضرورت ہے نہ اعمال کی۔ اس کو میں نے بسط کے ساتھ عرض کر دیا۔

اسی قبیل سے یہ لفظ ہے "اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ"۔ اس میں بھی ایک ضابطہ بتلایا گیا ہے قرآن سے نفع ہونے کا، اس کے اندر سب باتیں دین کی داخل ہو گئیں۔ اور یہ ضابطہ ایسا جامع ہو گیا، جیسے حساب دانوں کے یہاں گُر ہوتے ہیں جن کو گُر یاد ہوتے ہیں وہ کیسی جلدی حساب کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ گُر جانتے ہیں، باقاعدہ ضرب تقسیم سے حساب لگانے والا جس حساب کو منٹوں میں نکالے گا۔ اسی کو گُر جاننے والے سیکنڈوں میں نکال دیتے ہیں۔ اور باقاعدہ حساب لگانے والے کو قلم دوات، پنسل، کاغذ، تختی، سلیٹ کی ضرورت ہوتی ہے، اور گُر جاننے والوں کی زبان پر حساب کے گُر رکھے ہوئے ہیں۔ بات یہی ہے کہ ان کو حساب کے گُر یاد ہوتے ہیں مثلاً جتنے روپیہ کی سیر بھر چیز اتنے آنے کی چھٹانک بھر یا جتنے روپیہ کا ایک گز کپڑا اتنے آنے کا ایک گرہ۔ اس سے ہزاروں روپیہ کا حساب ذرا سی دیر میں زبانی ہی لگا لیا جاتا ہے غرض! گُر بھی تو ایک ضابطہ ہی کا نام ہے جو استقرار کے بعد وضع کر لیا جاتا ہے۔ گُر کا فائدہ

یہ ہے کہ حساب کرنے میں بہت سہولت اور جلدی ہوتی ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی اس آیت میں گُر بتا دیا ہے۔ قرآن سے نفع ہونے کا۔ تو دیکھئے! ایک گُر کتنے استقرار کے بعد وضع ہوتا ہے۔ اگر ہم قرآن سے نفع اٹھانے کا گُر وضع کرتے تو کتنے استقرار کی ضرورت ہوتی اور کتنے زمانہ میں اس میں کامیابی ہو سکتی تھی، پھر بھی ہمارا ذہن کہاں تک پہنچ سکتا تھا؟ لہٰذا یہ بالکل سچی بات ہے کہ برسوں کی محنت بھی اس کے لئے کافی نہ ہوتی۔ پس قدر کیجئے حق تعالیٰ کی رحمت کی کہ ہم کو اس محنت سے بچا دیا، اور اپنی طرف سے خود ہی اس گُر کی تعلیم کر دی جس کا مختصر عنوان علم و ہمت ہے۔ اب جس عمل میں کوتاہی ہوگی انہیں کی کمی سے ہو گی کسی کی نماز قضا ہو گئی تو اس کی وجہ یہی ہوگی کہ یا تو اس کی فرضیت ہی اس کو معلوم نہیں ظاہر ہے کہ جب ایک چیز کو آدمی ضروری ہی نہیں سمجھتا، تو اس کو وہ کرے گا کیوں؟ یا اگر فرضیت تو معلوم ہے لیکن ہمت نہ ہوئی کسی کام میں مشغول تھے، یا سو رہے تھے، نماز قضا ہو گئی۔ غرض کوئی کام ایسا نہیں نکلے گا جس میں کوتاہی انہیں دونوں کی کوتاہی سے نہ ہو اور یوں تو عام طور سے دونوں ہی میں کوتاہی ہو رہی تھی، لیکن ان میں سے بھی ہمت میں زیادہ کوتاہی ہے یعنی علم کی تو ذہنوں میں کچھ وقعت بھی ہے، اور اس کو صحیح سمجھتے ہیں کہ علم نہ ہوگا تو عمل بھی نہ ہوگا، لیکن ہمت اور قصد کی تو قریب قریب بالکل ہی وقعت نہیں۔ بہت سے لوگ مسائل کو جانتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کرتے، اس کی وجہ یہی ہے کہ قصد نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ مشائخ کے مرید ہوتے ہیں صرف اس قصد سے کہ سارا بار انہیں کے ذمہ ڈال دیں اور خود کچھ کرنا نہ پڑے۔ یہ وہی بات تو ہے کہ خود قصد کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اور اس غلطی میں صرف عام لوگ ہی مبتلا نہیں بلکہ پڑھے لکھے بھی مبتلا ہیں۔ ہم طلبہ سے بھی جب اعمال میں کمی ہوتی ہے تو صرف قصد کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے بات دراصل یہی ہے کہ ہم نے علم کی طرف تو توجہ کی اور جیسی توجہ تحصیل علم کی دیسی توجہ قصد کی تحصیل کی طرف نہیں کی۔ علم کی تحصیل کے لئے تو بہت وقت صرف کیا مگر قصد کی

تحصیل کے لئے کچھ بھی وقت صرف نہیں کیا۔ بڑی بھلی کتابیں ختم کرنے کے بعد بے فکر ہو گئے اور یہ سمجھ لیا کہ بس علم ہی کافی ہے، حالانکہ یہ فاش غلطی ہے۔ دیکھئے کسی نے ہر قسم کی مٹھائی بنانے کا علم تو حاصل کر لیا، اور اس کی تحصیل میں بڑی بڑی محنتیں کیں، اس فن کی تمام کتابیں جمع کر لیں، اور ساری عمر اس میں صرف کر دی لیکن کبھی مٹھائی کھانے کا قصد نہیں کیا، تو آپ بتا سکتے ہیں کہ کبھی اس کا منہ میٹھا ہو گا؟ ہرگز نہیں! جس کی وجہ بجز اس کے کیا ہے کہ اس نے قصد نہیں کیا۔

دیکھئے! قصد وہ چیز ہے کہ فرض کیجئے آپ کو سوتے میں پیاس لگی اور آنکھ کھل گئی مگر چونکہ کسل غالب ہے اس پیاس کو گوارا کیا اور پڑے رہے تو یہاں مقصود حاصل ہونے میں کس چیز کی کمی ہے؟ علم تو ہے یعنی حس ہے کہ پیاس لگی ہوئی ہے، لیکن اٹھ کر پانی پینے کا قصد نہیں ہوا۔ اس لئے پیاسے رہے۔ اس کے بعد فرض کیجئے کہ اسی شخص کے پاس اسی وقت حاکم کا حکم پہنچا کہ اسی وقت حاضر ہو تو آپ فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں اور دو میل کا سفر طے کر کے حاکم کے ڈیرے پر پہنچتے ہیں حتیٰ کہ سردی بھی لگی زکام بھی ہو گیا لیکن کام ہو گیا۔ اور کسل مانع نہ ہو سکا۔ بتائیے اس وقت ایک ہی شخص سے دو مختلف فعل کس چیز کے فرق سے صادر ہو گئے؟ ابھی تو اٹھا بھی نہیں جاتا تھا، حتیٰ کہ پیاس کی تکلیف گوارا کی یا ابھی ایسا چاق چوبند ہو گیا کہ سردی اور زکام سب کو برداشت کر لیا، اسی کو قصد کہتے ہیں۔ جب آدمی نے سمجھ لیا کہ جانا تو ہے ہی کیونکہ حاکم کا حکم آ چکا ہے تو اسی شخص سے جس سے پانی لانے کے لئے چار قدم نہ چلا گیا تھا اب چار میل چلا گیا۔ غرض! قصد اتنی بڑی چیز ہے اور اسی کا ترجمہ ہمت ہے۔ بس اسی کی ضرورت ذہنوں میں بہت کم ہو گئی ہے اور اس کے حاصل کرنے کی طرف توجہ بھی نہیں جیسے علم حاصل کرنے کی طرف بعض کو کسی درجہ میں ہے۔

غرض! قرآن سے نفع حاصل کرنے کی دو شرطیں تھیں جن میں ایک تو کسی درجہ میں ہے

بھی لیکن دوسری قریب قریب بالکل ہی نہیں۔ اس واسطے نفع نہیں ہوتا۔ یعنی علم تو کسی درجہ میں ہے بھی لیکن اس پر عمل کرنے کا ارادہ قریب قریب بالکل ہی نہیں کرتے اس میں شکایت صرف مولویوں کی نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو کسی مسئلہ کو جانتا ہے وہ اس کا عالم ہے وہ سب اسی شکایت میں داخل ہیں۔ سب نے ہمت ہار دی ہے اسی وجہ سے طرح طرح کی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ مثلاً ہمت ہی کی کمی ہے جو کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بلا سود کے گزر نہیں یا کہا جاتا ہے کہ بلا رشوت کے گزر نہیں، یا کہا جاتا ہے کہ باغوں کی بہار پھل آنے سے پہلے بیچنے کے بغیر گذر نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر حاکم وقت سود اور رشوت کو جرم قرار دے دے، اور ایسے ہی بہار قبل از وقت بیچنے کی بھی قانوناً ممانعت کر دے تو کیا پھر بھی کسی کو ہمت ہوگی ان کے کرنے کی؟ اس وقت یہ سب عذر رخصت ہو جائیں گے۔ دیکھئے! رشوت کے لینے میں حق تعالیٰ کے سامنے یہ عذر کیا جاتا ہے کہ اس بغیر گزر کیسے ہوگی اگر یہ عذر چلنے والا ہے تو اس کو حاکم کے سامنے بھی پیش کیجئے، اور کھلم کھلا رشوت لیا کیجئے، اور یہ ہی کہئے کہ ہم مجبور ہیں۔ دیکھیں وہ اس عذر کو سن لے گا یا نہیں۔ اور علانیہ رشوت لینے کی اجازت دے گا یا نہیں۔ حاکم کے قانون میں رشوت منع ہے اس واسطے کوئی عذر آپ کا نہیں چلتا۔ اور علانیہ رشوت نہیں لے سکتے اور کبھی حاکم کو علم ہو جاتا ہے اور ثبوت ہو جاتا ہے ——— تو اس پر سزا بھی ہو جاتی ہے۔ اور حق تعالیٰ کو تو ہر وقت علم ہے، ان کی سزا کا خوف کیوں نہیں ہوتا؟ غرض سزا کے خوف سے حاکم کے سامنے رشوت نہیں لے سکتے اس کا حاصل یہی تو ہے کہ خوف کی وجہ سے عزم ہو جاتا ہے رشوت سے بچنے کا، اور جب عزم ہو جاتا ہے تو پھر کام تو بلا رشوت لئے بھی چلتا ہی ہے۔ غرض کمی ہے تو عزم کی ہے۔ سود اور رشوت کے چھوڑنے کا چونکہ عزم نہیں ہے اس واسطے بہانے ڈھونڈھے جاتے ہیں۔

ایسے لوگ بھی بکثرت ہیں جنہوں نے باوجود قلت آمدنی کے پکا ارادہ کر لیا کہ سود

رشوت نہ لیں گے، چنانچہ عمر بھر نہیں لیا اور اسی برس کی عمر میں انتقال کیا، ان کی ضرورت کون سی اٹکی رہی؛ اب بعض لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر سود اور رشوت نہ لیں تو خرچ کہاں سے چلے، میں کہتا ہوں کہ خرچ کیا ہے؟ کیا اسی کا نام خرچ ہے کہ پاؤ بھر گھی ایک وقت میں کھایا جائے، اور تنزیب ہی پہنی جائے؛ خرچ کو کم کرو آخر خرچ کو کسی حد پر جا کر ختم کرتے ہی ہو۔ کیا کوئی مرتبہ ایسا نہیں نکلتا کہ اس سے زیادہ خرچ نہ کیا جاوے۔ اگر سو روپیہ مہینہ خرچ کرو گے تو ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو ایک ہزار روپیہ مہینہ خرچ کرتے ہیں تو ان کی برابری کی ریس کیوں نہیں کرتے؟ اور ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو پانچ روپیہ مہینہ خرچ کرتے ہیں، ان کی ریس کیوں نہیں کرتے؟ غرض! ضرورتوں کو بڑھا لیا پھر کہتے ہیں کہ بلا رشوت کے گذارہ کیسے ہو۔ کسی نے غالب کو ایک خط نظم میں لکھا تھا اس میں لفظ "ید" مشدد تھا جس کے حاشیہ پر یہ لکھ دیا "تشدید بضرورت شعر۔ غالب چونکہ بہت مسخرہ تھا اس نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا ؎

چہ خوش گفت فائق شاعر غرّا   کہ کس ہمچو من ذہن رسا نباشد
چو مقام ضرورت شعر افتد   تشدید جائز چرا نباشد

اس طرح اس کے فعل کا قبح اس جوابی شعر میں دکھا دیا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ "شعر گفتن چہ ضرور" اسی طرح خرچ بڑھانے کو میں کہتا ہوں کہ "خرچ افزوں چہ ضرور" ایسے خرچ ہی کرنے کی کیا ضرورت ہے جس کے لئے سود اور رشوت لینے کی ضرورت پڑے۔ اس کی تعلیم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا میں ہے وہ دعا مقفی ہے نظم نہیں ہے کیونکہ حضور کے ارشادات نظم میں نہیں ہوتے تھے "وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ"

وہ دعا یہ ہے وَمِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ وَقَلْبٍ لَا یَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ یہاں تک مقفّٰی چلی آتی ہے اگلا جملہ ہے" وَمِنْ دَعْوَۃٍ لَا یُسْتَجَابُ لَھَا" یہاں قافیہ چھوڑ دیا۔ میں جب حدیث پڑھاتا تھا تو یہ وسوسہ ضرور ذہن میں آتا تھا کہ یہ جملہ بھی مقفّٰی کیوں نہ ہوا اس کا مقفی ہونا کچھ مشکل نہ تھا ہم جیسے بدلیاقت آدمی بھی چاہیں تو قافیہ ملالیں۔ مثلاً یوں کہہ دیتے وَمِنْ دَعْوَۃٍ لَا تُسْمَعُ لیکن وجہ یہ ہے کہ نبیؐ کا کوئی فعل تعلیم سے خالی نہیں اس میں تعلیم ہے کہ تصنّع سے بچنا چاہیئے خصوصاً دعا میں کیونکہ دعا حق تعالیٰ سے عرض حال اور سوال کا نام ہے۔ حق تعالیٰ احکم الحاکمین ہیں، حاکم ہونے کا مقتضا ہیبت ہے، ہیبت کے مقام پر کسی کو آپ نے قصداً اور تکلفاً مقفی عبارت بولتے نہ سنا ہوگا اس میں تعلیم ہوگئی کہ ضرورت کو خواہ مخواہ تصنیف نہ کرو۔ اختراعی ضرورت کو آگ لگاؤ وہ کام کرو جس کا حکم ہے۔ خرچ اتنا مت بڑھاؤ جس کے لئے گناہ کرنا پڑے۔

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شادی کے متعلق جس میں بہت زیادہ خرچ کیا گیا تھا جس میں نیت محض ناموری کی تھی، یہ فرمایا کہ خرچ تو خوب کیا لیکن اتنے خرچ سے ایسی چیز خریدی جس کو اگر بیچنے لگیں تو پھوٹی کوڑی کو بھی کوئی نہ لے وہ کیا چیز ہے؟ "نام" بس ایسے ہی لوگوں نے اخراجات غیر ضروریہ اختراع کر رکھے ہیں۔ مرتے ہیں، کھپتے ہیں، برباد ہوتے ہیں مگر ان کو پورا کرتے ہیں۔ ارے آگ لگاؤ ایسی ضرورتوں کو۔ یہ دیکھو کہ شریعت کا حکم کیا ہے۔ شریعت پر چلنے سے دین تو سدھرتا ہی ہے دنیا کی بربادی سے بھی حفاظت رہتی ہے۔

ایک شخص نے ایسے غیر ضروری اخراجات کی حقیقت بڑی لطافت سے ظاہر کی۔ بلند شہر میں ایک رئیس زادے تھے ان کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ لوگوں نے چالیسواں کرنے کے لئے مجبور کیا اس وقت تو وہ مجبوراً راضی ہوگئے اور جبراً قہراً اپنے باپ کا چالیسواں کیا جس میں انہوں نے بہت تکلف کیا، ایک پورا کیمپ کا کیمپ گویا تیار کیا گیا۔ آٹھ دس

طرح کے بہت پُرتکلف کھانے پکوائے، لیکن جب مہمان دسترخوان پر بیٹھ گئے اور کھانا چُن دیا گیا تو قبل کھانا شروع ہونے کے صاحبزادے تشریف لائے اور کھڑے ہوکر کہا کہ مجھ کو کچھ عرض کرنا ہے۔ جب سب متوجہ ہوگئے تو یہ کہا کہ "آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ آپ اس وقت کس تقریب میں تشریف لائے ہیں؟ وہ تقریب یہ ہے کہ میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے، اور یہ بھی مسلم ہے کہ باپ سرپرست ہوتا ہے اس کا سر پہ سے اٹھ جانا ظاہر ہے کہ کس قدر صدمہ کی بات ہے۔ اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ میرے ساتھ ہمدردی کی جاتی کیا یہی ہمدردی ہے کہ مجھ پر تو اتنا بڑا پہاڑ غم کا ٹوٹ پڑے اور آپ آستینیں چڑھا چڑھا کر پلاؤ قورمہ کھانے بیٹھ جائیں؟" اس کے بعد کہا کہ بسم اللہ شروع کیجئے۔ اس تقریر سے سب پر ایسی غیرت سوار ہوئی کہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اسی وقت ایک محضر نامہ لکھا جس پر سب نے دستخط کئے کہ آج سے اس قسم کی سب رسوم موقوف۔ کسی نے پوچھا کہ "صاحبزادے جب کہلاتا ہی نہ تھا تو یہ خرچ ہی کیوں کیا؟" کہا کہ اگر میں یہ سامان نہ کرتا تو اس کو بخل پر محمول کرتے اور کہتے کہ شریعت کو تو محض آڑ بنایا ہے، دراصل اپنا خرچ بچایا ہے۔ اب یہ کہنے کا کسی کو منہ نہیں رہا اور میری اس وقت کی تقریر کا پورا اثر ہوا اور نہ یہ بات نہ ہوتی اور رسم نہ مٹتی۔ پھر وہ کھانا مساکین کو کھلا دیا اور دعا کی اور باپ کو ثواب بخش دیا تو واقع میں تخفیف اخراجات کی سخت ضرورت ہے۔ مگر ہم لوگوں نے ایسی آنکھیں بند کی ہیں کہ دین کی تو کیا سوجھتی دنیا کی بھی نہیں سوجھتی۔

کیرانہ میں کچھ گوجر رہتے ہیں۔ ایک گوجر کا باپ بیمار ہوا تو اس نے ایک حکیم کو بلا کر اس کے بہت ہاتھ جوڑے اور کہا کہ اجی حکیم جی! اب کے تو میرے باپ کو اچھا ہی کر دو کیونکہ اس سال چاول بہت مہنگے ہیں اگر اس وقت مر گیا تو تیجے، دسویں، چالیسویں میں تو میرا دیوالہ ہی نکل جائے گا۔" دیکھئے! باپ کے مرنے کا تو غم نہیں اپنا دیوالہ نکل جانے کا اندیشہ ہے۔ صاحبو! یہ کیا حالت ہے کچھ تو عقل سے کام لینا چاہیئے۔

اگر دین کا بھی خیال نہیں تو دنیا ہی کا خیال کیجئے ذرا دیکھئے تو کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ اجی دین کی تعلیم تو وہ چیز ہے کہ اس سے دنیا بھی سدھرتی ہے۔ چنانچہ یہ فضول خرچیاں وہ ہیں جن کو نئے تعلیم یافتہ بھی منع کرتے ہیں۔ اس باب میں وہ بھی علماء کے ساتھ متفق ہیں۔ مگر ان پر ہمارا یہ اعتراض ہے کہ یہ آپ کا منع کرنا مسلمانوں کی اصلاح کے لئے نہیں، بلکہ اپنے مطلب کے لئے ہے۔ کیونکہ وہ ان رسوم سے اس واسطے منع کرتے ہیں کہ اپنی پسند کی فضول خرچیوں کی گنجائش ملے۔ اور وہ فضول خرچیاں کیا ہیں؟ کوٹ پتلون، اور دوسری فیشن کی چیزیں، چنانچہ دیکھ لیجئے جو نئے تعلیم یافتہ پرانی رسوم کو بند کرتے ہیں۔ وہ اس سے زیادہ اپنی فضولیات میں خرچ کرتے ہیں۔ تو یہ کہنا صحیح ہے کہ دنیا کو منع کیا گیا دنیا کے لئے۔ ایک خرابی سے بچے تو اس سے بدتر خرابی میں پڑے۔ تو جو غرض منع کرنے سے تھی وہ خاک بھی حاصل نہ ہوئی۔ اور یوں کھڑے ہو کر بڑی تیز زبانی سے کہتے ہیں کہ "مولویوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ مسلمان کس حال کو پہنچ گئے ہیں۔ اس وقت ان کی دنیا کی درستی کی بھی ضرورت ہے، لیکن علماء جب وعظ کہیں گے تو بس نماز کا روزہ کا دنیا کو چھوڑنے کا حالانکہ اب وہ وقت ہے کہ علماء کو چاہیئے دنیا کا وعظ کہا کریں۔

اس کے متعلق قابل غور یہ بات ہے کہ علماء کے ذمہ دنیا کی تعلیم ہے یا نہیں تقسیم کام کا مسئلہ تو آجکل دنیا بھر کے نزدیک مسلم ہے۔ علماء بحیثیت رہبر دین ہونے کے دین کے ذمہ دار ہیں یا دنیا کے۔ سارے کام انہیں کے سر کیوں ڈالتے ہو۔ اگر یہی بات ہے تو ہم کہتے ہیں کہ آپ دنیا کی تعلیم کرتے ہیں۔ دین کی کیوں نہیں کرتے؟ مولویوں کے کسی وعظ میں تو دنیا کے متعلق بھی بیان سنا ہوگا لیکن آپ کے لیکچروں میں تو کبھی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا بیان سنا ہی نہیں جاتا۔ اور یہ جو آپ رسوم کے متعلق غل شور مچاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو اسراف سے بچاتے ہیں اور اسراف شریعت میں ممنوع ہے۔ تو گویا دین کی تعلیم بھی کرتے ہیں کیونکہ گناہ سے بچاتے ہیں۔ تو اس کی حقیقت وہ ہی ہے جو میں نے

بھی بیان کی کہ یہ دین کی تعلیم ہی نہیں نہ یہ گناہ سے بچانا ہے، بلکہ یہ تو ایک نوع کے اسراف کو بند کر کے دوسری نوع کے اسراف کے لئے گنجائش نکالنا ہے۔ پس یہ تو دنیا کی تعلیم دنیا ہی کے لئے ہوئی۔ اور مولوی جو اسراف کو منع کرتے ہیں تو دین کے لئے کرتے ہیں کسی دنیوی غرض کے لئے نہیں کرتے۔ تو ان کی دنیا کی تعلیم بھی دین ہی کے لئے ہے۔ تو اگر تقسیم کام کا مسئلہ آپ کے نزدیک مُسلّم نہیں ہے تو آپ بھی دین و دنیا دونوں کے کام کیجئے اور مولوی بھی دونوں کے کام کریں۔ اور اگر تقسیم کام کا مسئلہ مسلم ہے جیسا کہ آج دنیا بھر کا اس پر اتفاق ہے تو آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ مولویوں پر اعتراض کریں کہ وہ بس دین ہی دین کا کام کرتے ہیں دنیا کا کام کیوں نہیں کرتے۔

اب اس کا راز سنئے کہ مولویوں نے اپنے ذمہ صرف دین ہی کا کام کیوں لیا ہے، بات یہ ہے کہ گو دنیا بھی بقدر ضرورت ضروری ہے لیکن پھر بھی دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کیونکہ دین کے سامنے دنیا کی کچھ بھی تو حقیقت نہیں وہ باقی ہے، یہ فانی ہے، وہ کامل ہے یہ ناقص، لیکن باوجود اس تفاوت کے معاملہ برعکس ہے، کہ دنیا کی ضرورت اور اہمیت تو سب کے ذہنوں میں ہے اور دین کی ضرورت سے غفلت ہے۔ اسی لئے علماء نے دین کی ترغیب و تعلیم کو اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ رہی دنیا! سو اوّل تو خود ہی لوگ اس کی ضرورت کو سمجھے ہوئے ہیں۔ دوسرے اس کی تعلیم آپ لوگوں نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ گو اس کا طریق جو آپ نے اختیار کیا ہے وہ غلط ہے اور علماء اس غلطی کو بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

پس اس حالت میں علماء کی شکایت کرنا ایسا ہے جیسا فرض کیجئے کہ حکیم عبدالمجید خان کے پاس ایک مریض پہنچا اس کو دیکھ کر حکیم صاحب نے تشخیص کیا کہ مرض سخت ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر علاج فوراً نہ کیا گیا تو دق ہو جاوے۔ پھر بہت غور کے ساتھ نسخہ لکھ کر دیا کہ اس کا باقاعدہ استعمال کرو جب وہ نسخہ لکھوا کر لوٹا تو دروازہ پر ایک چمار بھی بیٹھا ہوا تھا اس نے پوچھا کہ حکیم جی نے کیا بتلایا۔ اس نے سب حال سنا دیا۔ اس پر چمار نے کہا کہ تمہاری جوتیاں بھی

تو بیٹی ہوئی ہیں ان کے سلوانے کے لئے حکیم جی نے کوئی بھی مشورہ نہیں دیا۔ بس صرف نسخہ ہی لکھ دیا۔ اس سے یہی کہا جائے گا کہ ارے یہ تو تیرا کام ہے حکیم جی کا کام نہیں۔ البتہ حکیم صاحب جوتی سلوانے سے منع نہیں کریں گے۔ لیکن اگر وہ چمار اس طور پہ جوتی سینے لگے کہ جوتی کے ساتھ پاؤں میں سے بھی سوا نکالنے لگے تو اس وقت حکیم صاحب ضرور اپنا فرض منصبی سمجھ کر کہ بدن کو ضرر سے بچانا ضروری ہے اس فعل کو منع کریں گے۔ اسی طرح علماء دنیا سے منع نہیں کرتے۔ لیکن جب وہ یہ دیکھیں گے کہ دنیا سے دین کا نقصان ہو رہا ہے اور دنیا کی تحصیل کے لئے خلاف دین طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں، تو اس وقت ان کا فرض منصبی ہوگا کہ وہ مسلمانوں کو دین کے ضرر سے بچا دیں۔ اگرچہ دنیا کے حصول میں کچھ کمی واقع ہوتی ہو۔

خلاصہ یہ کہ جب علماء اپنا فرض منصبی ادا کر رہے ہیں پھر ان پر اعتراض کیسا۔ البتہ اگر علماء دین کی تعلیم کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے کاموں سے بالکل روکتے مثلاً یہ کہتے کہ کھانا مت کھاؤ، کپڑا مت پہنو، مکان مت بناؤ، تجارت مت کرو، تب تو یہ اعتراض کسی درجہ میں صحیح بھی ہوتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ "علماء" دین کی تعلیم تو خود کرتے ہیں، اور دنیا کو حدود دین کے اندر رکھتے ہوئے آپ کی رائے پر چھوڑتے ہیں۔ پھر ان پر کیا اعتراض۔

یہاں تک تو تعلیم یافتہ لوگوں سے خطاب تھا ان سے بڑھ کر بعض بے باک جاہل یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ "گناہ کریں گے تو ہم خود بھگتیں گے آپ کو کیا پڑی"۔ میں کہتا ہوں کہ واقعی بھگتیں گے تو آپ ہی، لیکن علماء کے ذمہ بھی تو فرض ہو گیا کہ آپ کو متنبہ کریں وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں، پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔ انہیں جاہلوں میں سے بعضے لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ مولوی کہتے ہیں کہ گناہ کا وبال آئے گا۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ گناہ کرنے والے چین کرتے ہیں، کسی کا کان بھی گرم نہیں ہوتا۔ علماء کی کچھ عادت ہی ہو گئی ہے کہ بات بے بات "گناہ گناہ" ہی پکارتے رہتے ہیں۔ اور دنیا کی ان کو خبر نہیں کہ غیر قومیں تو دھڑا دھڑ سودے لے رہی ہیں، اور بڑھتی چلی جاتی ہیں، نہ کسی پر کوئی وبال آتا ہے، نہ کچھ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کسی چیز سے فوراً نقصان نہ ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ آئندہ بھی اس کا

نقصان ظاہر نہ ہوگا۔ دیکھئے! کوکیں کہاں سے فوری کون سی تکلیف ہوتی ہے؟ کوئی بھی نہیں بلکہ بعض فائدے حاصل ہوتے ہیں جن کے واسطے وہ کھائی جاتی ہے۔ لیکن اگر طبیب کسی کو کوکیں کھاتے دیکھ لے تو وہ ضرور منع کرے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ گو اس وقت تو اس کا کوئی نقصان ظاہر نہیں ہوا، لیکن انجام اس کا خون کا خشک ہو جانا، اور مہلک امراض کا پیدا ہونا ہے۔ اس واسطے وہ منع کرتا ہے۔ وہاں کوئی یہ نہیں کہتا کہ لوگ کوکیں سے کیا فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ نہ کسی کا خون خشک ہوتے دیکھا، نہ کسی کو مرتے دیکھا۔ اور حکیم صاحب ہیں کہ منع ہی کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا کہے تو اسی کو بے وقوف بنایا جائے گا نہ کہ حکیم صاحب کو۔ اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ یہ ظاہری کوکیں دنیا میں مضر ہے، اور غفلت اور معصیت کی کوکیں آخرت میں مضر ہوگی۔ پس علماء کا احسان ماننا چاہیئے کہ وہ اس سے منع کرتے ہیں۔ گناہ سے صرف چند روز کی آسائش ہے۔ لیکن جب آدمی مرے گا تو کہے گا کہ مولوی سچ کہتے تھے۔ لیکن اس وقت اس کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ مولوی! دنیا کو منع نہیں کرتے اور دنیا کی باتوں میں دخل نہیں دیتے ہاں جب ضرر دینی کی نوبت آجاتی ہے تب وہ دخل دیتے ہیں اور منع کرتے ہیں۔ تو اب وہ شبہ نہ رہا کہ مولوی دنیا کو منع کرتے ہیں۔ اور وہ جو آپ نے کہا تھا کہ مولوی دنیاوی تعلیم نہ کریں تو دنیا سے منع بھی تو نہ کریں۔ اس کا حل ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اعتراضات کی بناء ہی غلط فہمی پر ہے۔ آپ علماء سے ملتے نہیں، آپ کو ان کے حالات معلوم نہیں، دور بیٹھے جو چاہتے ہیں ان پر تہمت لگا دیتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی ایک یہ وجہ بھی ہے کہ آپ کے قلب میں ان کی عظمت نہیں۔

اور میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ وہ حضرات دنیائے مباح کو تو کیوں منع کرتے، بعض اوقات دنیائے غیر مباح کو بھی کسی بڑے دینی ضرر سے بچانے کے لئے گوارا کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص ہے کہ وہ کسی ناجائز نوکری میں مبتلا ہے، اور اس کے پاس اور کوئی جائز ذریعہ معاش نہیں ہے، اس کو احساس ہوا کہ میں ناجائز کام کرتا ہوں۔ اب وہ کسی محقق عالم سے پوچھتا ہے کہ "میں

یہ نوکری چھوڑ دوں ؟" تو وہ بحالت موجودہ اس کو یہ جواب دیتے ہیں، کہ نہیں جلدی نہ کرو، کسی جائز ذریعۂ معاش کا انتظام کر لو پھر چھوڑنا۔ اور ایسی حالت میں وہ حضرات اس واسطے منع نہیں کرتے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت تو وہ ایک ہی گناہ میں مبتلا ہے، اس کو چھوڑ کر بہت ممکن ہے کہ ناداری کا تحمل نہ ہونے سے بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جائے۔ کیونکہ احتیاج وہ چیز ہے کہ اس کی بدولت بہتوں نے خودکشی کر لی ہے۔ بہت سے نعوذ باللہ مرتد ہو گئے ہیں تو وہ محقق اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے قلب میں تحمل نہیں، اگر میں اس نوکری کو چھوڑنے کی اجازت دے دوں گا تو پھر ایمان تک کی خیر نہیں۔ البتہ اگر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کسی میں صفت تحمل موجود ہے تو پھر اس کو بلا ضرورت ناجائز میں مبتلا رہنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ کیونکہ ایسی صورت میں ایسا کرنا جائز ہی کہاں ہو سکتا ہے۔ اور جب تحمل اتنی بڑی چیز ہے تو میں اس تحمل کے پیدا ہونے کا طریقہ بتلاتا ہوں۔ وہ طریقہ غلبۂ محبت الٰہی کا حاصل کرنا ہے۔ یہ غلبۂ محبت وہ چیز ہے کہ جو مشکل سے مشکل چیز کو آسان کر دیتی ہے۔ دیکھو! دنیا میں سب سے مشکل چیز موت ہے، جس کے نام سے بھی ہم لوگوں کو موت آتی ہے۔ مگر اہل محبت کے قصے پڑھیئے وہ تو موت کی تمنائیں کرتے ہیں۔ ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

لہ خرم آن روز کزیں منزل ویران بردم — راحت جان طلبم در پئے جانان بردم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے — تا درِ میکدہ شادان و غزل خوان بردم

ایک بزرگ انتقال فرماتے وقت یہ اشعار پڑھتے ہیں ؎

لہ چیست توحید آنکہ از غیر خدا — فرد آئی در خلاءُ در ملا
وقت آن آمد کہ من عریان شوم — جسم بگذارم سراسر جان شوم

لہ

لہ

موت کا آسان ہوجانا تو کیا معنے ان کے تو حوصلے ہی کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ ایک بزرگ جن کا نام ابن الفارض ہے ان کے روبرو مرتے وقت آٹھوں جنتیں پیش کی گئیں۔ ہمارے نزدیک تو اس سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی تھی۔ مگر انہوں نے فوراً منہ پھیر لیا اور یہ شعر پڑھا ؎

اِنْ کَانَ مَنْزِلَتِیْ فِی الْحُبِّ عِنْدَکُمْ ۔۔۔ مَا قَدْ رَأَیْتُ فَقَدْ ضَیَّعْتُ اَیَّامِیْ

یہ ایک خاص حالت تھی۔ اس وقت ان کی نظر جنت سے بھی بڑی نعمت پر تھی، یعنی لقائے حق، جو مقصود بالذات ہے) اور جنت بھی اسی لئے مطلوب ہے کہ وہاں یہ نعمت نصیب ہو گی۔ اسی کو کہا گیا ہے۔

؎ چوں بجنت وعدۂ دیدار آمد لاجرم ۔۔۔ عاشقاں جنت برائے دوست میدارند دوست

غرض! حضرت ابن الفارض پر مرتے وقت ایک خاص کیفیت طاری تھی جس کے اثر سے انہوں نے جنتوں کے پیش کئے جانے پر بھی اپنا منہ پھیر لیا، اور مذکورہ بالا شعر پڑھا۔ بس پھر اسی وقت ان سے وہ جنتیں محجوب کر دی گئیں اور ایک تجلی خاص ہوئی اور دم نکل گیا۔ غرض یہ وہ حضرات تھے جن میں محبت حق ساری چیزوں پر غالب تھی۔ حتیٰ کہ محبت جنت پر بھی۔ یہاں سے حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی شرح ہوتی ہے ؎

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد ۔۔۔ تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

واقعی ان کے نزدیک موت مکروہ تو کیا ہوتی بلکہ محبوب ہے۔ کیونکہ وہ وسیلہ ہے ان کے مقصود کے حاصل ہونے کا۔ غرض! غلبۂ محبت الٰہی ایسی چیز ہے کہ جو ہر چیز کا تحمل پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لئے محققین طالب کے قلب میں پہلے اس کو پیدا کرتے ہیں، اس کے بعد ناجائز نوکری وغیرہ چھڑاتے ہیں۔ بلکہ پھر تو ان کو خود اس باب میں کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، وہ آپ ہی چھوڑ دیتا ہے۔ بلکہ اگر کوئی منع بھی کرتا ہے، تو رسیاں تڑا کر اس سے کوسوں بھاگتا ہے۔ ایسے ناجائز کام پھر اس سے ہو ہی نہیں سکتے۔

اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان حضرات کا کسی ناجائز کام سے فی الحال منع

نہ کرنا اس کے جواز کی بنا پر نہیں، بلکہ دو ناجائز چیزوں میں سے جس کا مفسدہ شدید تھا اس سے بچانے کے لئے خفیف مفسدہ کو عارضی طور پر گوارا کر لیتے ہیں۔ اس لئے ان پر یہ اعتراض بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ حضرات، بعض کو ناجائز نوکری سے کیوں منع نہیں کرتے؟ وہ منع ضرور کرتے ہیں مگر تدبیر اور سلیقہ سے اور اس طرح کہ پھر جڑ ہی کٹ جائے۔ اگر اس وقت منع کریں تو دو چار دن کو وہ نوکری چھوڑ دے گا لیکن پھر گھبرا کر کرے گا، یا اس سے بھی بدتر مفاسد میں مبتلا ہو گا۔ اور اس تدبیر سے چھڑانے کے بعد اس کو پھر کبھی وسوسہ بھی نہیں آئے گا۔ اس بات کو محققین ہی سمجھ سکتے ہیں کہ کس کا تحمل کتنا ہے، جس کو وہ دیکھتے ہیں کہ ابتدار ہی سے تحمل ہے۔ اس کو وہ ابتدار ہی سے روکتے ہیں۔ اس تشخیص میں وہ مجتہد ہیں، ان سے منازعت کا کسی کو حق نہیں۔ اگر بالفرض وہ غلطی بھی کریں گے تو مجتہد کی غلطی قابلِ گرفت نہیں۔ اس صورت میں بھی ان کو اجر ملتا ہے۔ واذا اخطأ فلہ اجر اب دونوں شبہے رفع ہو گئے۔ یہ شبہ بھی کہ "مولوی دنیا کو منع کرتے ہیں" چنانچہ معلوم ہو گیا کہ مولوی دنیا کو منع نہیں کرتے حتیٰ کہ بعض اوقات "دنیائے ناجائز" کو بھی منع نہیں کرتے۔ اور یہ شبہ بھی کہ "ناجائز کام کو کیوں منع نہیں کرتے؟" وہ بھی حل کر دیا گیا کہ منع کرتے ہیں لیکن تمام پہلوؤں پر نظر کر کے۔ اب آپ کا یہ الزام بالکل غلط ہو گیا کہ مولوی دنیا کو منع کرتے ہیں۔ البتہ یہ پہلے بھی کہہ دیا گیا ہے کہ وہ خود تعلیم دنیا کی نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ ان کا کام نہیں۔ اور جس دنیا کو وہ منع کرتے ہیں وہ دنیا وہی ہے جو دین میں مضر ہے۔ یعنی جو دنیا دین کو خراب کرتی ہے، سو اس سے منع کرنا ان کے فرائض میں داخل ہے۔ رہا یہ کہ جائز دنیا کی تعلیم کیوں نہیں کرتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اتنی دنیا جو دین کو خراب نہ کرے وہ مسلمانوں کو حاصل بھی ہے اور جن کو حاصل نہیں وہ اس کی کوشش میں خود ہی مشغول ہیں۔ پھر تحصیل حاصل سے کیا فائدہ؟

دین البتہ آجکل مسلمانوں کے پاس بقدر ضرورت بھی موجود نہیں۔ یعنی فرائض تک بھی ادا نہیں کرتے۔ بتلائیے کتنے مسلمان ہیں جو پابندی سے نماز پڑھتے ہیں، اور کتنے

مسلمان ہیں جو باقاعدہ زکوٰۃ دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ - جس فرض اور رکن دین کو آپ دیکھیں گے مسلمانوں کو اس میں قاصر پائیں گے - پھر کیا بیجا ہے اگر علماء ان ہی کے متعلق وعظ کہیں؛ کیونکہ دنیا بقدر ضرورت موجود ہے، اور دین بقدر ضرورت بھی موجود نہیں - تو کس کی تعلیم کی ضرورت ہوئی؟ انصاف کیجئے - اور یہ سب کلام اس صورت میں ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ علماء دنیا کی تحصیل کی تعلیم نہیں کرتے - حالانکہ یہ امر خود محل کلام ہے - بلکہ اس میں ایک خاص تفصیل ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے دو درجے ہیں - ضروری اور غیر ضروری - سو وہ حضرات غیر ضروری کی بے شک تعلیم نہیں کرتے لیکن ضروری کی خود شریعت میں بھی تعلیم ہے اور ان حضرات کے ارشادات میں بھی مصرح ہے - چنانچہ حدیث ہے "کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ" اور "حضرت سفیان ثوری" رحمۃ اللہ علیہ کا باوجود سید التارکین ہونے کے یہ ارشاد ہے کہ "جس کے پاس کچھ نقدی ہو اس کو محفوظ رکھنا چاہیئے، اگر ہم محتاج ہوتے تو امراء ہم کو ہاتھ کا رومال بنا لیتے" یعنی ذلیل کرتے، جیسے رومال کہ اس سے میل کچیل پونچھا جاتا ہے - شریعت میں کہیں بھی یہ تعلیم آپ دکھا سکتے ہیں کہ "روپے پیسے کو ضائع کرو، اور بے موقع اڑا دو"؟ بلکہ اس کی سخت ممانعت کی گئی ہے - اگر مسلمان شریعت پر عامل ہوتے تو نہ دوسروں کے دست نگر ہوتے، نہ دوسروں سے مغلوب ہوتے - اس لئے سخت ضرورت ہے کہ جس کے پاس مال ہو وہ تھوڑا بہت جمع کر کے بھی رکھے نفس کی تسلی کے لئے -

غرض خرچ کو کم کیا جائے اور اسراف سے بچا جائے - مجھ سے ایک عورت نے مشورہ کیا کہ "اپنے مکان سب وقف کر دوں؟" میں نے اس کو منع کیا - بعض لوگوں نے کہا کہ یہ تو مناع للخیر بننا ہے - میں نے کہا نہیں بلکہ یہ مناع للشر بننا ہے کیونکہ میں جانتا تھا کہ عورت ناقص العقل ہے، اس وقت تو جوش میں کارِ خیر سمجھ کر وقف کر رہی ہے اور کل کو اگر احتیاج پیش آئی تو وہ پھر پچھتائے گی اور اس خیر کو بُرا کہے گی - اور خدا جانے کہاں تک نوبت پہنچے تنگدستی میں مستقل رہنا بڑے بڑوں کو بھی مشکل ہے - تو اس وقت کی خیر موجب ہو جائے گی

آئندہ کے شر کی۔ اس لئے بس عافیت اسی میں ہے کہ ایسی خیر ہی نہ کرو۔ معترضین کی نظر اس بات تک پہنچی۔ جو چیز دوسروں کو آئینہ میں نظر نہیں آتی کسی کو اینٹ میں نظر آجاتی ہے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ ایک شخص نے (جس کو کسی ظالم نے ایک جائداد کے مقدمہ میں پریشان کر رکھا تھا) حضرت حاجی صاحب سے کہا کہ میں پھر اپنا حق ہی چھوڑ دوں؟ حضرت نے فرمایا بہتر ہے کہ صبر کرو حافظ صاحب نے کہیں سن لیا، اور بڑے زور کے ساتھ اس سے منع کیا کہ ہرگز صبر نہ کرنا، مقدمہ کرو، ہم دعا کریں گے۔ اور حضرت حاجی صاحب کی طرف خطاب کیا کہ یہ آپ نے اس کو بتلا دیا۔ آپ کے تو بیوی نہ بچہ، آپ نے دنیا کو چھوڑ دیا۔ وہ دنیا کو چھوڑے گا تو تو بیوی بچوں کا کیا حشر ہوگا؟ یہ بھی تو سوچ لیا ہوتا؟ یہ سن کر حضرت حاجی صاحب خاموش ہو گئے اور اپنے حجرہ میں چلے گئے۔ اسی واقعہ میں غور کر لیجئے! معلوم ہو جائے گا کہ وہ خود دنیا کو چھوڑنا چاہتا تھا مگر اس کو اس سے منع کیا گیا۔ اور مباح دنیا کی حفاظت کا مشورہ دیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک بات اور قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ اس مشورہ کو سن کر کہ "حرام نوکری کو فوراً نہ چھوڑنا چاہیئے" کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو کہ پھر اسی طرح سود اور رشوت کو بھی حلال کر دینا چاہیئے، کیونکہ اس کی بھی آجکل سخت ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کس نے کہا ہے کہ محققین حرام نوکری کو حلال کر دیتے ہیں۔ ان کی تعلیم کا خلاصہ تو یہ ہے کہ وہ چھوٹے مفسدہ کو بڑے مفسدہ کے خوف سے کچھ دن کے لئے گوارا کر لیتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ تدبیر سے چھڑا دیتے ہیں۔ اس میں اور حلال کرنے میں بڑا فرق ہے۔ حلال چیز تو کبھی حلال نہیں ہو سکتی۔ پاخانہ کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے! کسی کے ہاتھ پاخانہ میں سن گئے تو اب دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے فوراً ہاتھ کو زمین پر ایسا رگڑا کہ پاخانہ کی نجاست تو زائل ہو گئی لیکن ہاتھ بھی زخمی ہو گیا۔ اب تکلیف ہے اور چلا رہا ہے؟ اور ایک یہ صورت

ہے کہ اس نے تھوڑی دیر کے لئے صبر کیا اور پانی لاکر دھو ڈالا۔ اس صورت میں نجاست بھی زائل ہوگئی اور کوئی تکلیف بھی نہ ہوئی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جتنی دیر تک اس نے صبر کیا وہ نجاست نہ رہی، یا اس کو پاخانہ برا نہ معلوم ہوتا تھا، یا اس کو پاک سمجھتا تھا۔

اس پر یاد آیا! میں انجمن نعمانیہ لاہور میں بلایا گیا، اور علماء بھی بلائے گئے تھے۔ اہل شہر کی اہل جلسہ سے یہ درخواست تھی کہ علماء مسئلہ سود پر غور کر کے کوئی صورت جواز کی نکالیں کیونکہ آجکل مسلمانوں کی ترقی کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے، اس کے بغیر ترقی ہو ہی نہیں سکتی۔ مولوی سلیمان صاحب پھلواروی نے جب میری آمد کی خبر سنی تو فرمایا کہ بس اب اس مسئلہ کا صحیح صحیح فیصلہ ہو جائے گا، اور جو امر حق ہوگا وہ ظاہر ہو جائے گا۔ مختلف علماء نے مختلف تقریریں کیں۔ پھر آخر میں میری نوبت آئی۔

میں نے عدم جواز پر تقریر کی۔ "لیکن ایک خاص عنوان سے"۔ میں نے کہا کہ صاحبو! سود لینا ترقی کا موجب ہے؟ یا سود کو حلال سمجھنا بھی ترقی کے لئے شرط ہے؟ مثلاً ایک شخص سود تو لیتا ہے مگر اس کو حرام سمجھتا ہے۔ اور دوسرا سود بھی لیتا ہے اور اس کو حلال بھی سمجھتا ہے، تو میں کہتا ہوں کہ ان دونوں کی ترقی میں کیا فرق ہوگا؟ کچھ بھی نہیں، کیونکہ "روپیہ" جس کو مقصود اور ترقی کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے وہ تو دونوں ہی کے پاس آجائے گا۔ پھر حلال ثابت کرنے کو ترقی میں کیا دخل ہوا؟ اگر ایسی ہی حرص ہے ترقی کی تو اس کے پیچھے اپنے عقیدہ کو کیوں خراب کرو۔ سود لینا ہی ہے تو سود لو۔ لیکن خدا کے لئے اس کو خواہ مخواہ حلال تو نہ سمجھو۔ حرام سمجھ کر بھی اگر سود لوگے تو کیا تمہاری مطلوب ترقی حاصل نہ ہوگی۔ لیجئے میں نے ایسی ترکیب بتلادی ہے کہ عقیدہ کا عقیدہ درست رہے اور ترقی کی ترقی ہو جائے۔ پھر میں نے ترقی کر کے کہا کہ اگر ہمارے مولوی بھی فتوٰی جواز سود کا دے دیں تب بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے عام مسلمان سود کو جائز نہ سمجھیں گے۔ کیونکہ اس کی صریح حرمت قرآن مجید میں موجود ہے، اور اس حرمت کا سب کو علم ہے۔ اگر خدانخواستہ علماء کا سود کے جواز پر اتفاق بھی ہوگیا، پھر بھی

عام مسلمان یہی کہیں گے کہ ہمارے علماء ہی خود بگڑ گئے۔ کہیں سود بھی کسی کے حلال کئے حلال ہو سکتا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ افسوس! آج کل لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء شریعت کو ربڑ بنا دیں کہ جس طرف کو وہ کہیں اسے کھینچ تان کر اسی طرف لے جائیں۔ اور جس چیز سے چاہیں اس کا سرا ملا دیں۔ جس چیز کو وہ حلال کرانا چاہیں اس کو حلال کر دیں۔ ان سے یہ توقع نہ رکھیئے۔

سو اوّل تو سود اور رشوت کی ضرورت ہی تسلیم نہیں یہ کیا ضرور ہے کہ پلاؤ قورمہ ہی کھاؤ۔ تن زیب ہی پہنو جس کے لئے ان چیزوں کے حلال کرانے کی فکر ہو۔ موٹا چال چلن رکھو۔ سادہ زندگی بھی تو ایک چیز ہے۔ شریعت کی تعلیم سادہ زندگی ہے اس کو اختیار کرو کسی گناہ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ آپ کو کچھ ایسی ضرورتیں لاحق ہیں جن سے آپ بزعم خود مجبور ہیں، تو حرام کماؤ۔ مگر یہ کیا ضرور ہے کہ حرام کو حلال کرنے کی کوشش کرو؟ کیونکہ حرام کا کسب تو گناہ ہی کا مرتبہ ہے، اور تحلیل حرام کفر ہے۔ گناہ اور کفر میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟ پھر خواہ کوئی مرتبہ ہو مگر ہم کو گناہ اور کفر میں کیوں شریک کرتے ہو۔ ہم سے ایسے فتووں کی کیوں توقع رکھتے ہو؟ ایسی درخواستیں کر کے لوگوں نے مولویوں کو ہاں میں ہاں، ملانے کے لئے نوکر رکھنا شروع کیا ہے۔ جیسے ایک حکایت ہے کہ ایک رئیس کے یہاں لازمی طور پر ایک نوکر ہاں میں ہاں ملانے کے لئے رہا کرتا تھا چنانچہ ایک نوکر انہوں نے رکھا اور یہی خدمت سپرد کی کہ جو بات ہم کہیں اس کی تم تصدیق کر دیا کرو۔ ایک دن کہنے لگے "ہم شکار کے لئے گئے تھے ایک ہرن مادہ گولی اس کا سُم[1] توڑ کر پیشانی پھوڑ کر نکل گئی" لوگ ہنسنے لگے کہ کہاں سُم کہاں پیشانی۔ نوکر صاحب بولے "حضور بجا فرماتے ہیں۔ وہ ہرن اس وقت پیشانی کھجلا رہا تھا" جانور کی عادت ہوتی ہے کہ سُم سے

---

[1] کھُر۔

کھجلاتا ہے۔ گویا انہوں نے تصدیق کر دی کہ سُم کو توڑنے اور پیشانی کو چھوڑنے کی یہ صورت ہوئی کہ سُم اور کھوپری ایک ہی جگہ تھے۔ کیونکہ کھوپڑی کو سم سے کھجلا رہا تھا اس حالت میں ایسا نشانہ مارا کہ گولی سُم کو توڑ کر اور کھوپڑی کو چھوڑ کر پار نکل گئی۔ اب آپ لوگ بھی بس یہ چاہتے ہیں کہ مولویوں سے یہ کام لیں۔ سو حضور مولویوں سے ایسی نوکری نہیں ہوتی اوّل تو زیادہ مولوی ایسے ہیں کہ فتوٰی لکھنے کی تنخواہ نہیں لیتے۔ اور جو بیچارے پیٹ کی خاطر تنخواہ بھی لیتے ہیں تو یہ کام ان سے بھی نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی خاطر دین نہیں بیچا جاتا۔

کوئی اجتہادی امر ہوتا تو شاید فتوٰی بھی دیا جا سکتا۔ لیکن قرآن کی آیت سود کے بارہ میں صریح موجود ہے وَحَرَّمَ الرِّبٰوا پھر بھلا کسی کی مجال ہے کہ اس کی حلت کا فتوٰی دے دے ؟ جیسا بد دینوں نے یہ شیوہ اختیار کیا ہے، چنانچہ بعضے ذہین مگر جاہل لوگوں نے اس میں بھی ایک ایجاد کی ہے اور یہ کہہ دیا ہے کہ قرآن میں ربوا (بکسر را) ہے ہی نہیں جس کے معنے "سود" کے ہیں بلکہ رُبوا (بضم را ہے) اور مشتق ہے رُبُودَنْ سے۔ جیسے دلربا۔ ہوشربا رُبُودَنْ کے معنی "اُچک لے جانا" تو اس سے ممانعت ہوئی ڈکیتی، اور غصب کی۔ اور کہتے ہیں یہ مولویوں کی اختراع ہے کہ رُبوا پر زیر لگا دیا۔ یہ تحریف نئے لوگوں کی ایجاد ہے اللہ بچائے۔ غرض اوّل تو بہت سے ذرائع حرام ہیں۔ ضرورت ہی کا درجہ مسلم نہیں۔ اور اگر تمہاری خاطر سے مان بھی لیا جاوے تب بھی غایت سے غایت یہ ہے کہ حرام کماؤ، مگر دین میں تو ترمیم مت کرو، گناہ کو گناہ ہی کے مرتبہ میں رہنے دو۔

اور میں اس وقت تمہاری خاطر سے کہتا ہوں کہ خیر گناہ کر لو۔ لیکن جب تمہاری ایک درخواست میں نے منظور کی تو تم بھی میری دو درخواستیں منظور کر لو۔ ایک تو یہ کہ گناہ کرو مگر اس کو سمجھتا گناہ اور حرام ہی (جیسا ابھی بیان کر چکا ہوں) اور ایک یہ کہ سوتے وقت دن بھر کے گناہوں کا حساب کر لیا کرو۔ یعنی تھوڑی دیر اس طرح محاسبہ کیا کرو کہ صبح سے ہم نے اس وقت تک کیا کیا گناہ کئے۔ خصوصاً وہ گناہ جو معاش کے متعلق ہیں۔ کیونکہ مال حرام سب سے

بُری چیز ہے، یہ تخم ہے تمام گناہوں کا۔ سو اس طرح گناہوں کو یاد کیا کرو اور زبان سے کہا کرو کہ "اے اللہ میں بڑا نالائق ہوں، اس قابل ہوں کہ غرق کر دیا جاؤں کہ کوئی عذر میرے پاس نہیں، میں نے بہت ہمت کی مگر مجھے کامیابی نہیں ہوتی، آپ مدد کیجئے اور اس خباثت سے نکال دیجئے" میں یہ ایسی کام کی بات بتا رہا ہوں کہ اوّل تو اس سے وہ گناہ ہی چھوٹ جائے گا اور اگر بالفرض نہ چھوٹا اور ساری عمر بھی اسی میں مبتلا رہے تب بھی اتنا فائدہ پہنچے گا کہ مرتے وقت ایک ہی گناہ سر رہے گا۔ کیونکہ جب روز توبہ کی جاتی ہے تو اس سے ماضی کا تو کفارہ ہو جاتا ہے۔ تو بجائے اس کے کہ سو دن کے گناہ سر ہوتے ایک ہی دن کے رہ جائیں گے۔ یہ بھی کچھ تھوڑی بات نہیں۔

دیکھئے ایک مجرم پر دس دفعات لگا کر سزا کی جاتی ہے تو وہ اپیل کرتا ہے۔ لیکن وکلاء کہتے ہیں کہ سزا ضرور رہے گی۔ ایک بیرسٹر کہتا ہے کہ کوشش کریں گے، اور امید ہے کہ تخفیف ہو جائے گی۔ اور بجائے دس "دفعات" کے ایک دو "دفعات" رہ جائیں گی۔ تو وہ کس قدر خوش ہوتا ہے اور بیرسٹر صاحب کی خوشامد کرتا ہے، اور کافی معاوضہ دینے کو تیار ہو جاتا ہے اور کہتا ہے یہی غنیمت ہے۔ اسی طرح اگر آخرت کی بہت سی دفعات لگی ہوئی ہوں اور ان میں معتدبہ کمی ہو جائے تو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ جو تدبیر میں نے بتلائی ہے اس سے آپ کے ذمہ صرف ایک دفعہ رہ جاتی ہے اور بدون اس کے بہت سی دفعات لگی ہوئی ہیں۔ یعنی بے فکری کا گناہ آپ کے ذمہ ہے۔ غفلت کا گناہ آپ کے ذمہ ہے، روزانہ عمل کا گناہ آپ کے ذمہ ہے، اگر یہ تدبیر کر دگے تو صرف ایک ہی عمل کا گناہ رہ جائے گا۔ یہ کیا تھوڑی بات ہے؟ اور ان گناہوں کے متعلق میں ایک اور کام کی بات عرض کرتا ہوں۔ نئی بات آپ کو سناتا ہوں آپ نے اب تک دو ہی باتیں سنی ہوں گی۔ ایک تو وہ بات جو مولوی صاحبوں کے وعظوں میں کہی جاتی ہے کہ ایک گناہ بھی چھوٹا ہو یا بڑا مت کرو۔ اور ایک وہ بات جو آزاد لوگوں سے سنی ہو گی کہ سب گناہ کرو ایک کو چھوڑنے کی بھی ضرورت نہیں۔

کیونکہ جب جہنم میں جانا ہی ٹھہرا تو پھر کیوں کسر رکھیں جو ہوگی دیکھی جائے گی یہ دو باتیں ہوئیں ان دونوں کے بین بین تیسری بات آپ نے نہ سنی ہوگی۔ وہ میں سناتا ہوں کہ گناہ دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ گناہ جن کے چھوڑنے میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ اور ایک وہ گناہ جن کے چھوڑنے میں کسی قدر تکلیف ہوتی ہے۔ اوّل کی مثال مردوں کو ریشم پہننا یا داڑھی منڈانا ہے۔ بتلائیے اس کے چھوڑنے میں کیا تکلیف ہوتی ہے، اور کس کام میں حرج ہوتا ہے۔ دنیا کا کون سا کام اس پر موقوف ہے؟ نہ معاش اس پر موقوف ہے، نہ صحت اس پر موقوف ہے پھر اس کے چھوڑنے میں آپ کے پاس کیا عذر ہے۔ اگر حق تعالیٰ سے ذرا سا بھی تعلق ہے تو ایسے گناہ کا تو خیال بھی نہ آنا چاہیئے کیونکہ حق تعالیٰ تو اس سے ناراض ہوتے ہیں اور دنیا میں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تو کیا عقل کی بات ہے کہ ایسا کام کیا جائے۔ کسی کام کے کرنے سے ایک معمولی حاکم کی ذرا نظر ترچھی دیکھی جاتی ہے تو سب کے خون خشک ہو جاتے ہیں، اور کیسی ہی ضرورت ہو مگر اس کام کو نہیں کیا جاتا۔ حق تعالیٰ تو احکم الحاکمین ہیں ان کی نظر ترچھی ہو اور کام بھی ایسا نہ ہو کہ ضروری ہو تو اس کے کرنے کیلئے مسلمان کی ہمت کیسے ہو سکتی ہے۔ غرض یہ قسم گناہ کی تو اس قابل ہے کہ فوراً ہی چھوڑ دی جائے۔ کیونکہ اس کے لئے کوئی معتدبہ داعی بھی نہیں سوائے لاپرواہی کے۔ ایسے گناہوں کو تو آج ہی چھوڑ دو۔

اور گناہ کی دوسری قسم کی مثال مثلاً ناجائز نوکری کرنا ہے میں ایسے گناہوں کو ایک دم نہیں چھڑاتا اس کے لئے وہ ہی طرز عمل رکھو جو میں نے ابھی بیان کیا ہے، کہ رات کو ان کو یاد کرو اور اپنی خطا کا اعتراف کرو اور زبان سے کہو کہ "اے اللہ میں نالائق ہوں، میں خبیث ہوں، میرے پاس کوئی عذر نہیں۔ میں گناہگار ہوں، اپنی غلطی سے شرمندہ ہوں" روز اسی طرح کیا کرو۔ اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو میں نے ابھی کہا تھا، کہ اوّل تو وہ گناہ چھوٹ جائے گا، اور اگر ساری عمر بھی نہ چھوٹا تو صرف ایک دفعہ کے آپ مجرم

رہیں گے۔ لیجئے میں نے ایسی آسان تدبیر بتلادی ہے جس کی نسبت میرا دعوٰی ہے کہ اس سے زیادہ تخفیف دس برس تک بھی کسی مصلح سے نہ سنیئے گا۔ اب آپ کے پاس کیا عذر ہے۔

صاحبو! قیامت میں حق تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کرنا اور عذر پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ درحقیقت تو مشکل سے مشکل کام کے لئے بھی کوئی عذر نہیں ہوسکتا کیونکہ حق تعالیٰ کو بحق الوہیت حق حاصل ہے کہ جو چاہیں امر کریں خواہ وہ کام مشکل ہو یا آسان لیکن حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا تکلیف مالایطاق کو بالکل برطرف رکھا ہے۔ کوئی حکم ایسا نہیں دیا جس میں طاقت سے زیادہ تکلیف ہو۔ بلکہ اتنی تکلیف بھی تو نہیں ہے۔ جتنی معمولی حکام دنیا کے احکام میں ہوتی ہے۔ اور معمولی "تکلیف" نہیں۔ اور میں نے جو ایک شق نکالی ہے اس میں تو معمولی تکلیف بھی نہیں رہی اور بہت ہی آسانی ہوگئی۔ اور اس پر جو میں نے آپ سے اس وقت سوال کیا ہے، کہ باوجود اتنی سہولتوں کے آپ کے پاس کیا عذر ہے۔ اگر حق تعالیٰ اسی کا اعادہ فرمادیں تو آپ کے پاس کیا جواب ہوسکتا ہے۔ سمجھ لیجئے! اور غور سے کام لیجئے۔

اس بیان پر شاید بعض طبیعتوں میں یہ شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ یہ تو گناہ کی تعلیم کی جارہی ہے سو سمجھ لو! کہ یہ گناہ کی تعلیم نہیں، بلکہ ترک گناہ کی تعلیم ہے۔ ہاں اس کے لئے سہولت کی سبیل نکالی گئی ہے جیسا مفصل مذکور ہوا۔ اب اس شق کے متعلق ایک بات باقی رہی ہے، وہ یہ کہ جس گناہ کے ترک سے کوئی تکلیف نہ ہو ظاہر ہے کہ ایسے گناہ کسی لذت دنیاوی کی وجہ سے ہی کئے جاتے ہیں۔ بلکہ ہر گناہ میں کچھ نہ کچھ تو لطف ہے ہی۔ سو اس طرح کرنے سے جب گناہ چھوٹیں گے یا محاسبہ سے سب گناہ چھوٹ جاویں گے تو وہ لذات بھی چھوٹ جائیں گے۔ تو یوں کہیئے کہ دنیا ہاتھ سے گئی بس دنیا میں ملاّ بن کر رہیں گے تو دنیا کی زندگی کا لطف تو گیا۔ میں کہتا ہوں کہ واقعی اس کا اثر اخیر میں ہوگا تو یہی۔ مگر آپ اس سے گھبراتے

کیوں ہیں؟ یہ دنیا کی لذتیں اسی وقت تک لذتیں ہیں جب تک کہ دوسری لذتیں سامنے نہیں آئی ہیں۔ ان سے بڑھ کر لذتیں کچھ اور بھی ہیں۔ جن کا ابھی آپ کو پتہ نہیں ہے نہ وہ بیان میں آسکتی ہیں۔

بس ایک مثال سے میں آپ کو بتائے دیتا ہوں وہ مثال یہ ہے کہ بچے مٹی سے کھیلتے ہیں، اور بہت سے کھلونوں سے کھیلتے ہیں، پتنگ اڑاتے ہیں، اچھلتے ہیں، کودتے ہیں ان کاموں میں ان کو کیسا مزہ آتا ہے۔ حتیٰ کہ انہیں باتوں میں آپس میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ روتے ہیں، پیٹتے ہیں، بڑوں تک فریاد لے جاتے ہیں، وہ کہتا ہے میرا کھلونا چھین لیا، وہ کہتا ہے میرا ٹھیکرا چھین لیا۔ غرض ان کے نزدیک سب سے بڑی لذتیں یہی کھیل کھلونے ہیں۔ لیکن آپ! ان کو منع کرتے ہیں، ہر وقت روک ٹوک کرتے ہیں، ان کو میاں جی کے سپرد کر دیتے ہیں، جس سے ان کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ اور جب سے یہ سب کھیل کھلونے چھن جاتے ہیں، اور کھیل کود چھوٹ جاتے ہیں۔ اس سے ان کو کیسی حسرت ہوتی ہے مگر آپ کی شفقت اس حسرت کا کچھ خیال نہیں کرتی، اور ساری لذات کے چھوٹ جانے کی کچھ پرواہ نہیں کرتی، اور ان کو باندھ باندھ کر مدرسہ بھیجتی ہے۔ آپ ان سے یہی تو کہتے ہیں کہ یہ کھیل کود کی لذتیں کیا ہیں۔ تو پڑھ لکھ جائے گا تو ڈپٹی ہو گا، تحصیلدار ہو گا، کرسی پر بیٹھ کر حکومت کرے گا۔ یہ اچھا، یا ان پڑھ رہنا اور کھیل کود میں رہنا۔ اور کچھ آنے کے وقت تکلیف کا محسوس کرنا اچھا؟ بچہ کی سمجھ میں اس وقت آپ کی ایک بات بھی نہیں آتی، اور وہ آپ کی روک ٹوک اور تعلیم کو ظلم کہتا ہے بتائیے آپ اس کو اس وقت کس طرح سمجھا سکتے ہیں۔ اور آپ کو اس وقت کیا کرنا چاہیئے۔ آیا بچہ کو اس کے خیال پر چھوڑ دینا چاہیئے یا بہلا پھسلا کر یا سختی سے جبراً قہراً تعلیم دلانی چاہیئے؟ جو اس بات کا جواب ہو گا لذات دنیا چھوٹ جانے کے متعلق وہی میرا جواب ہے، کہ آپ کو اس وقت تو بہلا کر راہ پر لگا لیا ہے، اور سہولت کی تدبیر بتلائی ہے جس کا اثر وہ ہی ہو گا کہ دنیا چھوٹ جائے گی اور دین سر چڑھ جائیگا

مگر جب حقیقت واضح ہوگی اس وقت اس کی قدر ہوگی۔

اس سر پڑ جانے پر ایک قصہ یاد آیا۔ ایک ڈوم تھا۔ وہ روزہ رکھنے سے بہت گھبراتا تھا، اور یہ مسئلہ کہیں سن لیا تھا کہ چاند دیکھنے سے روزہ واجب ہوتا ہے۔ بس آپ نے کیا کیا کہ چاند رات کے وقت گھر میں بیٹھ رہا کہ کہیں چاند نظر نہ پڑ جائے اور روزہ واجب نہ ہو جاوے۔ جب کئی روز ہو گئے بیوی نے گھر سے نکال دیا۔ جنگل جو گیا دن چھپے کے وقت پاخانہ کی ضرورت ہوئی نظر نیچے کئے ہوئے پاخانہ کیا اور بہت احتیاط کی کہ چاند نظر نہ پڑ جائے۔ لیکن ایک تالاب پر جو آب دست کرنے بیٹھے تو تالاب کے پانی میں چاند کا عکس نظر آگیا۔ بہت خفا ہوئے، اور چاند کو مخاطب بنا کر کہنے لگے جا کم بخت سر ہی ہوتا پھرتا ہے۔ تو حضرت! دین اس طرح سر پڑے گا جیسے چاند اس ڈوم کے سر پڑ گیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب دین آگیا تو دنیا بھاگے گی۔ تو یہ خیال بالکل سچا ہے کہ دنیا کی لذتیں چھوٹ جائیں گے۔ مگر اس میں برائی کیا ہے؟ کیونکہ ان سے بہتر لذتیں حاصل ہو جائیں گی، اور جب ان سے بہتر لذتیں حاصل ہوئیں تو ان کے چھوٹنے سے گرانی بھی نہ ہوگی جیسے کسی سے ایک کوڑی چھن جائے اور اس کے بدلے ایک اشرفی مل جائے تو اس کو کیا گرانی ہو سکتی ہے۔

دین کی لذت وہ چیز ہے کہ ذرا محسوس ہو جائے تو پھر کوئی لذت بھی اس کے سامنے حقیقت نہیں رکھتی۔ یہی راز ہے اسبات کا کہ قبیلہ بنی ثقیف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اوّل عرض کیا کہ ہم اسلام لاتے ہیں، مگر اس میں دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ جہاد میں نہیں جائیں گے۔ دوسرے زکوٰۃ و خیرات کچھ نہیں کریں گے۔ حضورؐ نے اس کو منظور فرمالیا۔ اس وقت کوئی ناسمجھ آدمی کہہ سکتا ہے کہ ایسے اسلام لانے سے فائدہ کیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیسے منظور کر لیا؟ اس کا جواب یہی ہے کہ حضور کو معلوم تھا کہ دین ایسی چیز نہیں ہے جو پاس آنے کے بعد خود نہ لپٹ جائے۔ بس ان کے صرف اسلام کو منظور فرمالیا پھر دیکھ لیجئے اسلام ان کو ایسا لپٹا کہ اپنی سب شرطیں بھول گئے۔ مال بھی خرچ کیا، اور جان بھی

خرچ کی (جہاد کیا) اسی طرح ہماری اس تعلیم کی حقیقت یہی ہے کہ ہم دین کا چسکا لگانا چاہتے ہیں۔ اور دین کی سڑک پر ڈالتے ہیں۔ سڑک پر پہنچ کر ایک ایسا باغ ملے گا جس کی بہار آپ کو خود ہی کھینچ لے گی۔ تو اب میری تعلیم پر اعتراض نہ رہا۔

دیکھئے! کس قدر آسانی ہو گئی۔ جس کا خلاصہ میں مکرر اعادہ کرتا ہوں کہ میں تکلیف کے گناہ کو فی الحال نہیں چھڑاتا یعنی وہ گناہ جن کے چھوڑنے میں آپ کو تکلیف ہو۔ صرف تکلف کے گناہ کو چھڑاتا ہوں۔ یعنی وہ گناہ جن کو آپ نے بتکلف بلا ضرورتِ طبعیہ اپنے ذمہ لے رکھا ہے، جن کے چھوڑنے میں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ سو ایسے گناہوں کو چھوڑنا کیا مشکل ہے۔ اتنی تو ہمت کرو، تراشے ہوئے گناہ چھوڑ دو۔ مگر کم سمجھوں کی یہ حالت ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ شریعت پر عمل کرو، اور گناہوں کو چھوڑو تو کہہ دیتے ہیں کہ کیا کھانا پینا چھوڑ دیں، مر جائیں، میں کہتا ہوں کہ مر دمت، مگر تھوڑی تکلیف تو گوارا کر و۔ میں تو فی الحال ان گناہوں کو چھڑاتا ہوں جن کے چھوڑنے سے موت نہیں آتی۔ پھر وہ اعتراض کہاں رہا کہ شریعت پر عمل کریں تو کیا مر جائیں۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ ہوا پرست لوگ برا کہیں گے، سو اس سے مت ڈرو۔ اور میں کہتا ہوں کہ برا کہنے کی کہاں تک پرواہ کی جائے گی؟ اگر کوئی چاہے کہ سب کو راضی کر لے تو یہ ناممکن ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ کسی کا برا کہنا اور ملامت کرنا بجا ہے یا بے جا ہے۔ اگر بے جا ہے تو عقل مند کا کام یہی ہے کہ اس کی پرواہ نہ کرے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر ملامت سے آپ ڈرتے ہیں، تو گناہ پر بھی تو ملامت ہوتی ہے، تو ملامت ہی کے خوف سے گناہ کو چھوڑنا چاہیئے۔ وہ ملامت معلوم بھی ہے کس کی ہوتی ہے؟ وہ اللہ کی ہوتی ہے، اور رسولؐ کی ہوتی ہے۔ کیونکہ گناہ کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملامت کرتے ہیں، اور رنجیدہ ہوتے ہیں، حضور کا دل دکھتا ہے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہفتہ میں دو بار عرضِ اعمالِ امت ہوتا ہے۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں کے گناہ حضورؐ کے سامنے آتے ہوں گے تو حضورؐ کو کس قدر رنج ہوتا ہو گا۔ حضورؐ کی شان

تو یہ ہے کہ کفار پر بھی اس قدر رنج فرماتے تھے گویا جان دینے کو تیار ہیں۔ قرآن میں ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ؕ (القرآن) یعنی شاید آپ اپنی جان کو تلف کر دیں گے، اس رنج میں کہ کفار ایمان نہیں لاتے۔ جب کفار پر حضورؐ کو اس قدر شفقت تھی، تو مسلمانوں پر کیا کچھ ہوگی۔ جس وقت مسلمانوں کی بداعمالیاں پیش ہوتی ہوں گی تو حضور پہ کیا گزرتی ہوگی ؟ کیا یہ کوئی مسلمان گوارا کر سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دے ؟

اس تکلیف پر ایک حکایت یاد آئی۔ غالباً مرزا قتیل کا قصہ ہے کہ وہ داڑھی منڈایا کرتے تھے۔ ایک شخص ان سے ملنے آئے اور از روئے نصیحت ان سے کہا کہ "آغا ریش می تراشی ؟"[1] مرزا قتیل نے جواب میں کہا "آرے ریش می تراشم لیکن دل کسے نمی خراشم" اس شخص نے فوراً کہا "آرے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می خراشی" اس جملہ کا مرزا قتیل پر یہ اثر ہوا کہ بے تاب ہو گئے، اور وجد کی سی کیفیت ہو گئی، اور توبہ کی۔ اور بزبانِ حال بار بار یہ کہتے تھے ؎

جزاک اللہ[2] کہ چشمم باز کردی مرا با جانِ جان ہمراز کردی !

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرا با جانِ جان ہمراز کردی

سو سب سے بڑی ملامت تو اللہ اور رسولؐ کی ہے۔ اور درحقیقت بچنے کی چیز یہی ہے اگر لوگ ملامت کریں تو ایک طرف ان کی ملامت، اور ایک طرف اللہ اور رسولؐ کی ملامت۔ اپنے دل سے پوچھو کہ کون سی ملامت قابلِ لحاظ ہے۔ مسلمان تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ اور رسولؐ کی ملامت لوگوں کی ملامت سے کمتر ہے۔

---

[1] جناب آپ داڑھی منڈواتے ہیں ؟ بیشک داڑھی منڈواتا ہوں لیکن کسی کا دل زخمی نہیں کرتا۔ بیشک رسول اللہؐ کا دل زخمی کرتے ہیں [2] اللہ آپ کو جزا دے کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔

اس کے متعلق اور سنیئے! حضرت آپ ہیں عاشق آپ کو اللہ اور رسولؐ کے ساتھ تعلق عشق کا ہے چنانچہ ارشاد ہے "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" (القرآن) یہاں مطلق مومن کے لئے شدتِ حُبّ کو ثابت کیا گیا۔ شدتِ حُبّ عشق ہوئی جب آپ عاشق ہیں، تو عاشق کی شان یہی ہے کہ ملامت سے نہ ڈرے۔ عاشق کو تو ملامت میں لطف آیا کرتا ہے۔ پھر آپ کو لوگوں کی ملامت سے آیا یہ اثر ہونا چاہیئے کہ عشق کو چھوڑ دیں یا یہ کہ اور چھیڑ چھیڑ کر ملامت کا لطف اٹھائیں؟ اور جب آیت قرآنی سے ہر مومن کا عاشق حق ہونا ثابت ہو گیا تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایک شعر جو مشہور ہے ؎

اہل دنیا کافران مطلق اند　　روز و شب در زق زق و در بق بق اند

اور اکثر "واعظ" لوگ اس شعر کو وعظ میں پڑھا کرتے ہیں۔ اس کو ظاہری معنی پر محمول کیا جاوے تو محض غلط ہے کیونکہ عاشق ہونے کے بعد اس کو کافر کیسے کہا جا سکتا ہے۔ البتہ ایک توجیہ سے صحیح ہو سکتا ہے وہ توجیہ یہ ہے کہ اس شعر کے پہلے مصرعہ کی ترکیب میں تقدیم و تاخیر ہے۔ یعنی "اہل دنیا" مبتدا ہے اور "کافرانِ مطلق" خبر ہے۔ مگر مقصود اس کا عکس ہے، یعنی "کافرانِ مطلق" مبتدا ہے اور اہل دنیا خبر تو مطلب یہ ہوا کہ فقط کافرانِ مطلق ہی دنیا دار ہیں۔ ان کے سوا مسلمانوں کو (خواہ وہ کیسے ہی گناہگار ہوں) دنیا دار مت کہو۔ مسلمان تو کسی حال میں بھی ہو تارک نماز ہو، بدکاری میں مبتلا ہو، زکوٰۃ نہ دیتا ہو۔ غرض سارے گناہ کرتا ہو تب بھی اس کو کافر نہیں کہہ سکتے۔

اور واعظ صاحبان یہ غضب کرتے ہیں کہ جو لوگ ایسے گناہوں میں بھی مبتلا نہیں صرف مال و دولت، اور عیش و آرام میں مشغول ہیں، ان کو بھی دنیا دار کہہ کر اس شعر کا مصداق قرار دیتے ہیں۔ اور لفظ کافر کا ان پر اطلاق کرنے سے باک نہیں کرتے۔ یہ کس قدر زیادتی ہے۔ مسلمان تو کیسا ہی دنیا میں مبتلا ہو پھر بھی اس کے قلب کو ایک خاص تعلق حق تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ اور اس تعلق کے اثر سے وہ اپنا گھر دنیا کو نہیں سمجھتا، بلکہ

اپنا اصلی گھر آخرت ہی کو سمجھتا ہے۔ یعنی وہ یہ سمجھتا ہے کہ وطن تو اس کا آخرت ہے لیکن وہ چندروز کے لئے مسافرانہ دنیا میں آگیا ہے۔ تو اب اس کی مثال ایسی ہو گئی جیسے کوئی باغپت کا رہنے والا مہینے دو مہینے کے لئے لکھنؤ والا نہیں کہا جاتا۔ نہ خود وہ اپنے آپ کو لکھنؤ کا رہنے والا سمجھتا ہے، نہ کوئی دوسرا۔

دیکھئے! سالہا سال بلکہ بعض صورتوں میں تمام عمر لوگ ملازمت کے سلسلہ میں وطن سے باہر رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی اپنے آپ کو رہنے والا اور کہیں کا سوائے اپنے وطن کے نہیں کہتے۔ حتٰی کہ کاغذات میں بھی اپنے نام کے آگے باغپتی، بجنوری، دہلوی لکھواتے ہیں۔ یعنی اپنی نسبت وطن ہی کی طرف کرتے ہیں۔ پھر جبکہ مسلمان اپنا اصلی گھر آخرت ہی کو سمجھتا ہے تو دنیا میں آکر اس کو دنیا والا یا دنیا دار کیسے کہا جائے۔ ہاں اپنی غفلت اور جہالت سے دنیا کے خارستان میں آکر چندروز کے لئے اس سے دل لگا لیا ہے۔ اور بوجہ غفلت کے بعض مسلمان بھی اس کے کانٹوں میں اپنے کپڑے پھڑواتے پھرتے ہیں۔ مگر جب وطن کا نام آئے تو آخرت ہی کا نام لیں گے۔ دنیا کی دلفریبیاں دیکھ کر آخرت سے ذہول[1] ضرور ہو جاتا ہے، لیکن یہ نہیں ہوتا کہ دنیا کو اپنا وطن سمجھنے لگیں۔ اسی کے خلاف کی شکایت مولانا جامی رح نے کی ہے ؎

دلا تا کے درین کاخ مجازی | کنی مانند طفلان خاکبازی!
توئی آن دست پرور مرغ گستاخ | کہ بودت آشیاں بیرون ازین کاخ
چرا زان آشیان بیگانہ گشتی | چو دونان چغد این ویرانہ گشتی

آگے مولانا نے وطن اصلی کو یاد دلایا ہے ؎

بیفشان بال و پر زین عالم خاک | بپر تا کنگرۂ ایوان افلاک

خیر! یہ تو بڑوں کی باتیں ہیں جن کو دنیا اور آخرت آنکھوں سے نظر آتی ہیں۔ وہ تو دنیا

[1] غفلت۔

کو کیوں پسند کرنے لگے ان کو تو دنیا سے نفرت ہوتی ہی ہے۔ مگر جو مسلمان بظاہر اور واعظوں کے قول کے موافق دنیا دار ہیں وہ بھی گو دنیا کے لذائذ اور تنعمات میں مبتلا ہیں مگر جب پوچھا جائے تو کہیں گے یہی کہ وطن آخرت ہے۔

خلاصہ یہ کہ ع اہل دنیا کافران مطلق اند

میں خبر مقدم اور مبتدا مؤخر۔ تو اس میں مسلمانوں پر اطلاق اہل دنیا کا نہ ہوا، بلکہ مطلب یہ ہوا کہ اہل دنیا ہونا منحصر ہے کفار میں۔ مسلمان کیوں ہوتا دنیا دار۔ ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی ادنیٰ مسلمان بھی ایسا فنا فی الدنیا ہو کہ ہر وقت دنیا ہی کا ذکر کرتا رہتا ہو اور کبھی اللہ اور رسول کا ذکر اس کی زبان پر نہ آئے۔ اس کا پتہ اس کے مقابل سے چلتا ہے کفار کو دیکھئے کہ ہر وقت دنیا ہی کی دھن میں رہتے ہیں۔ ریل میں ایک ہندو آکر بیٹھا اور اس نے سب سے پہلے مجھ سے یہ سوال کیا "کہ آپ کے یہاں غلہ کا کیا بھاؤ ہے؟" بس ان کا سفر ہے تو دنیا ہے، حضر ہے تو دنیا۔ یہ ہے زق زق اور بق بق جس کو اس شعر میں کہا ہے ع

روز و شب در زق زق و در بق بق اند

یہ حالت مسلمان کی کبھی نہیں ہو سکتی۔ یہ کفار ہی کے ساتھ خاص ہے جن کی یہ حالت ہے کہ ع چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

بس جن کی یہ حالت ہے انہی کو اس شعر میں اہل دنیا کہا گیا ہے۔ لیجئے اب اس شعر کے مصرعہ ثانی ہی سے جس میں روز و شب زق زق بق بق کا مضمون ہے پتہ چل گیا کہ مصرعہ اول میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی خبر مقدم اور مبتدا مؤخر ہے۔

غرض مسلمان دنیا دار نہیں بلکہ عاشق ہے، اور عاشق بھی صادق مگر اس نے جہالت اور غفلت سے اپنی مٹی پلید کر رکھی ہے۔ اور اپنا عشق اس قدر خفی کر دیا ہے کہ کسی کو اس کا احساس ہونا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ مگر حق تعالیٰ کو تو علم ہے اس واسطے

حق تعالیٰ کے نزدیک ان کا لقب عاشق ہی ہے۔ جیسا میں نے اوپر اس آیت سے ثابت کر دیا ہے "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" الخ جس میں کسی کی تخصیص نہیں کی نہ جنید کی نہ شبلی کی، نہ اگلوں کی، نہ پچھلوں کی۔ بلکہ جو ایمان رکھتا ہے ہر اس شخص کے واسطے یہی حکم ثابت کیا "اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ"۔ یعنی وہ خدا تعالیٰ کے برابر کسی سے محبت نہیں رکھتا۔ اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ وہ حق تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے۔ بلکہ اشد کا لفظ فرمایا جس کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمان کو شدید محبت حق تعالیٰ ہی سے ہوتی ہے۔ لیجئے ہر مسلمان کو حق تعالیٰ زمرۂ عشاق ہی میں شمار کرتے ہیں۔ آپ اپنی طرف سے کتنے ہی اس لقب سے الگ ہوں۔ مگر وہ آپ کو الگ نہیں کرتے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی کو عہدہ دیا گیا تحصیلداری کا اور وہ اس سے الگ ہونا چاہتا ہے، اور استعفیٰ دیتا ہے، لیکن حاکم بالا اس کا استعفیٰ منظور نہیں کرتا۔ تو وہ اس عہدہ سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے، لیکن اس کو علیحدہ نہیں ہونے دیا جاتا۔ غرض آپ کے واسطے عاشق کا خطاب ثابت ہو چکا۔ جب یہ ہے تو پھر عاشق کو ملامت سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔

دیکھئے! ایک مُردار عورت پر کوئی عاشق ہو جاتا ہے تو نہ گھر کی خبر رہتی ہے نہ یار کی، نہ مال کی پرواہ رہتی ہے، نہ جان کی، نہ آبرو کی، سب کو اس پر نثار کر دیتا ہے۔ اور ملامت سے ڈرتا تو کیا، ملامت میں اس کو لطف آتا ہے۔ پھر جبکہ آپ کا تعلق حق تعالیٰ جیسے احکم الحاکمین کے ساتھ عشق کا ہے تو ان کی رضا کے لئے جان یا مال یا آبرو کی کیا پرواہ ہونی چاہیئے۔ اور اہل دنیا کی ملامت سے ڈرنا کیا معنی؟ اب بتلایئے کیا عذر ہے آپ کو گناہ کے چھوڑنے میں اب تو معلوم ہو گیا کہ عاشق کے سامنے ملامت کوئی چیز ہی نہیں بلکہ عشق میں ملامت سے الٹا لطف آتا ہے۔ عاشق کی تو ہر حالت میں یہ شان ہوتی ہے ؎

ایدل آن بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی ۔۔۔ بے زر و گنج بصد حشمت قارون باشی

در رہِ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجان ۔۔۔ شرط اوّل قدم آنست کہ مجنون باشی

دیکھنے مجنوں کو ہر مصیبت کے لئے تیار رہتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ آپ اونٹنی پر سوار ہو کر لیلیٰ کی طرف چلے۔ اس اونٹنی کے ساتھ اس کا ایک چھوٹا بچہ تھا وہ پیچھے رہ رہ جاتا تھا اور اونٹنی بار بار اس کی طرف مڑتی تھی، جس سے سفر میں دیر ہوتی تھی۔ یہ رنگ دیکھ کر آپ نے یہ شعر کہا ؎

هوى ناقتي خلفي وقدامي الهوى　　وانی وایاها لمختلفان

یعنی میری ناقہ کا محبوب تو پیچھے ہے، اور میرا محبوب آگے ہے، تو میں اور وہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ یعنی وہ پیچھے کو جانا چاہتی ہے، اور میں آگے کو جانا چاہتا ہوں، پس اس اونٹنی ہی کو چھوڑنا چاہیئے اور پیدل چلنا چاہیئے۔ اس کے بعد اتنا صبر بھی نہ ہوا کہ اس اونٹنی سے باطمینان اتر لیتے۔ نہیں! بلکہ اپنے آپ کو اس کے اوپر سے گرا دیا۔ بہت چوٹ لگی، اور بدن پاش پاش ہو گیا۔ اب پیدل چلنے کے قابل بھی نہ رہے۔ اور سکون کس کو تھا جب کچھ بن نہ پڑا تو لڑھکنا شروع کیا کہ مقصود سے کچھ تو قرب ہو۔ یہاں کوئی خشک کہہ سکتا ہے کہ بڑی غلطی کی۔ اگر باقاعدہ اترتے تو چوٹ نہ لگتی اور پیدل ہی چل کر لیلیٰ کے پاس جلدی پہنچ جاتے۔ اس طرح گرنے میں چوٹ بھی لگی اور مقصود بھی فوت ہوا۔ اب زخمی پڑے ہیں کہ معمولی طور پر بھی چل نہیں سکتے۔ اس کا جواب آپ کو کیونکر سمجھایا جائے جو عشق کا مذاق رکھتا ہو وہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ عاشق کو بھلا اتنا ہوش کہاں کہ اونٹ کے اوپر سے یوں اترا کرتے ہیں، اور یہ قاعدہ ہے راستہ قطع کرنے کا۔ اس کا کام تو بس طلب ہے اور تڑپ طالب صادق کا قول تو یہ ہوتا ہے ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید　　یا تن رسد بجاناں یا جان ز تن برآید[ل]

اسی قصہ پر مولانا فرماتے ہیں کہ:

عشقِ مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود   گوئے گشتن بہرِ او اولیٰ بود

یعنی غیرت دلاتے ہیں مسلمانوں کو کہ جب مجنوں کا ایک عورت کے پیچھے یہ حال تھا، تو ہر مسلمان کا اللہ کی راہ میں کیا حال ہونا چاہیئے۔

غرض! عاشق کی تو یہ شان ہوا کرتی ہے جب آپ اللہ کے عاشق ہیں تو پھر کسی بات کا کیا ڈر، اور ملامت کی کیا پرواہ؟ ان کی رضا کے لئے سب کچھ گوارا ہونا چاہیئے۔ اس لئے آپ پہلے ہی سوچ لیجئے کہ اس طلب میں آپ کو کوئی ملا کہے گا، کوئی مسجد کا مینڈھا کہے گا، کوئی کہے گا کہ گلگلوں کی تسبیح گلے میں ڈال لو، میں کہتا ہوں کہ سب کی سن لو، اور جواب کسی کو مت دو۔ جواب دینا تو طالب علموں کا کام ہے، تمہارا کام نہیں۔ چوں وچرا کرنا طالبعلموں کا کام ہے۔ چنانچہ کیرانہ میں ایسا ہی ہوا۔ ایک طالب علم نے ایسی باتوں کا جواب خوب ترکی بترکی دیا۔ وہ بیچارے مسجد کے حجرہ میں رہتے تھے۔ ان سے کسی دنیادار نے کہا کہ مولوی لوگ تو مسجد کے مینڈھے ہوتے ہیں، انہیں کیا خبر کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ اس نے کہا جی ہاں! مگر مسجد کے مینڈھے دنیا کے کتوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ خیر اس جواب کا بھی ایک موقع ہے۔ مگر ہم تو اس کو بھی اچھا نہیں سمجھتے ہم تو کہتے ہیں کہ بجائے ترکی بترکی جواب دینے کے یوں کہنا چاہیئے تھا کہ اچھا بھائی تم ہم سے اچھے سہی۔ کیونکہ جب عشق کا دم بھرا تو پھر ملامت کی کیا پرواہ۔ مشہور مثل ہے کہ "جب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں سے کیا ڈر"۔ تم کو تو اس پر قناعت کرنا چاہیئے کہ ہم کو تو بفضلہ وہ دولت حاصل ہے کہ ملامت کرنے والے کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ وہ کیا ہے؟ وہ یہ کہ تمہارا عاشقانِ الٰہی میں نام لکھا گیا ہے۔

دیکھئے! ایک کیمیاگر کیمیا کے اوپر اتنا نازاں ہوتا ہے کہ اسے کوئی غریب رکھے، امیر کہے، بھلا کہے، برا کہے، وہ ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا کہ میں کیمیاگر ہوں۔ وہ اپنی کیمیا پر مست ہے دیکھنے والے اس کو لنگوٹ بند دیکھ کر غریب سمجھتے ہیں، بیوقوف سمجھتے ہیں۔ مگر اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کتنا خوش ہے۔ اسی طرح جبکہ آپ کو عشق کی کیمیا حاصل ہے تو آپ کو

دنیا سے استغنا رہونا چاہیئے۔ اور کوئی کچھ بھی کہے اپنی اسی کیمیا پر مست رہنا چاہیئے اس ملامت کی ایک نئی حکمت قلب میں اسی وقت وارد ہوئی، وہ یہ کہ جس کام پر ملامت ہوتی ہے اس پر آدمی زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ طبعاً اپنی بات کی پچ ہو جاتی ہے اور ضد میں آکر اس کام کو جس پر ملامت کی گئی ہے اور بھی زیادہ کرنے لگتا ہے۔ اور ایک چڑسی پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص کوٹھے پر چڑھتا ہو اور کمزوری کے باعث اس کو چڑھنا مشکل ہو تو اگر کوئی اس کو چڑا دے کہ "جی ہاں آپ چڑھ ہی تو جائیں گے۔ تو اس کو اس طعن سے ایک جوش سا پیدا ہو جائے گا اور جس طرح بھی بن پڑے گا چڑھ ہی کر دم لے گا۔ غرض ملامت سے ہمت قوی ہو جاتی ہے۔ اور یہ ہمت وہ چیز ہے جس کو طالب میں پیدا کرنے کے لئے شیخ وقت بہت تدابیر کرتا ہے۔ اور یہاں اس کو وہ بات بلا تدابیر کے ملامت ہی سے حاصل ہو گئی۔ تو بجائے برا ماننے کے اور خوش ہونا چاہیئے اور ملامت کرنے والا کا احسان ماننا چاہیئے کہ جو کام شیخ بھی مشکل سے کر سکتا وہ اس نے ذرا سی بات کہہ کر کر دیا۔ تو وہ ہمارا محسن ہوا یا دشمن۔

غرض آپ کسی کی عیب چینی سے نہ گھبرائیے اس سے کمی، چینی ملے گی اور عمل کی ہمت پیدا ہو جائے گی۔ اور ہمت وہ چیز ہے کہ حکمار دین کہتے ہیں کہ علم سے زیادہ ہمت کی ضرورت ہے۔ مگر آجکل تو ہمت کی بہت ہی کمی ہو گئی ہے، گو علم کی چنداں کمی نہیں۔ پہلے لوگوں میں اتنا علم نہ تھا جتنا اب ہے، مگر ہمت آجکل سے زیادہ تھی، اسی سے سارے کام درست ہو جاتے تھے۔ اور اس تفاوت سے کوئی یوں نہ سمجھے کہ علم کے متعلق کوئی شکایت نہیں۔ اس میں بھی بہت کوتاہیاں ہو رہی ہیں۔ اکثر لوگ علم حاصل تو کرتے ہیں مگر بے ڈھنگے طور پر چنانچہ بعضوں نے تو یہ سمجھ لیا کہ علم نام صرف عربی پڑھنے کا نہیں ہے علم ہر زبان میں آسکتا ہے کیونکہ علم کے معنی ہیں جاننا۔ جاننا عربی زبان سے بھی ہو سکتا ہے، اور اردو سے بھی ہو سکتا

ہے اور صرف زبانی تعلیم سے بھی ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ آجکل کتابیں اردو کی بکثرت موجود ہیں عربی کا مشغلہ ہی چھوڑ دیا جو بجائے خود ایک کمی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اردو کی کتابیں ہر فن کی موجود ہیں۔ مثلاً ڈاکٹری کا فن بقدر کفایت اردو میں موجود ہے پھر آپ خود اس کو دیکھ کر اس میں ماہر کیوں نہیں ہو جاتے۔ اور ماہرین نے اس کی تحصیل کے لئے انگریزی وغیرہ کی قید کیوں لگائی ہے۔ ڈاکٹری کے کالجوں میں اردو کی کتابیں کیوں نہیں پڑھا دیتے معلوم ہوا کہ عقلاء کے نزدیک یہ مسئلہ مسلم ہے کہ کسی فن کی اعلیٰ درجہ کی تکمیل اسی زبان میں ہو سکتی ہے۔ جس زبان میں وہ فن مدوّن ہے۔ ترجموں سے تکمیل نہیں ہوتی۔ پھر حیرت ہے کہ دنیا کے فنون میں تو یہ مسئلہ مسلم ہو، اور دین کے فنون میں مسلم نہ ہو۔ دین کے لئے صرف اُردو دانی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ دین میں دخل دینے کے لئے وہ لوگ بھی تیار ہو جاتے ہیں جن کو صرف اُردو دانی آتی ہے، بلکہ اُردو بھی صحیح طور سے نہیں آتی اور تلفظ اور املاء بھی ان کا صحیح نہیں۔ ایسے لوگ اہل فن یعنی علماء سے بحث مباحثہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

خیر اس جھگڑے کو چھوڑو۔ لو میں تنزل کرتا ہوں اور مطالعہ کو منع نہیں کرتا اُردو ہی میں دین کی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ مگر اس کا طریقہ تو سیکھ لو۔ محض اردو دانی کو کتاب کے سمجھنے کے لئے کافی مت سمجھو۔ بلکہ ان ہی اردو کی کتابوں کو کسی معتبر عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لو۔ جہاں سینکڑوں کاموں کے لئے وقت صرف کرتے ہو ایک آدھا گھنٹہ اس کے لئے بھی صرف کیا کرو۔ دیکھئے کوئی شخص اردو کی قانون کی کتاب دیکھ کر ایک عرضی دعویٰ بھی نہیں لکھ سکتا۔ یہ کام بھی وکیل ہی سے پوچھ کر کیا جاتا ہے۔ اور اگر قانون کا علم پورا بھی نہ حاصل کرنا ہو بلکہ بقدر ضرورت ہی حاصل کرنا ہو تو وہ بھی اسی طرح آسکتا ہے کہ قانون کی کتاب وکیل سے سبقاً سبقاً پڑھو گو قانون کی کتابیں اردو میں موجود ہیں، لیکن زبان کے آسان ہونے سے یہ کہاں لازم آیا کہ وہ فن بھی آسان ہے۔ یہ فن تو ایسا مشکل ہے کہ انگریزی دان اور پاس شدہ وکیل بھی ایک دم کام نہیں کر سکتے۔ پاس ہونے کے بعد بھی کسی وکیل کے پاس کام سیکھتے ہیں۔

تب وہ کام کے قابل ہوتے ہیں۔

اسی طرح دین کی کتابوں کی اُردو تو آسان ہے، مگر فن تو آسان نہیں۔ بس اردو سے آپ کو اتنی سہولت ہوگئی کہ آپ عبارت پڑھ سکتے ہیں۔ زبان کے سیکھنے کے لئے جتنا وقت عربی پڑھنے میں لگتا وہ نہیں لگے گا۔ لیکن اس سے فن کہاں آسان ہوگیا؟ اور علماء سے استغناء کیسے ہوگیا؟ بس طریقہ صحیح یہی ہے کہ اردو کی کتاب بھی اگر دیکھنا ہو تو اس کو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لو۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ دین کی طرف سے اتنی لاپرواہی ہے کہ اس کے لئے بھی کوئی تیار نہیں ہوگا کہ کتاب سبقاً سبقاً روزمرہ جاکر پڑھا کرے۔ اس لئے میں ایک اور اس سے زیادہ سہل تدبیر بتلاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ بطور خود ہی سہی لیکن جہاں سمجھ میں نہ آئے اس پر پنسل سے نشان لگادو اور ہفتہ میں ایک دفعہ یا پندرہ دن میں ایک دفعہ کسی عالم کے پاس جاکر ان مقامات کو حل کرلو۔ ان مقامات کے سمجھنے میں خود اجتہاد نہ کرو۔ اب بتایئے کہ اس سے کون سا معاش میں حرج ہوا۔ اب کوئی عذر آپ کے پاس علم کے حاصل نہ کرنے کے لئے نہیں ہے۔ یہ ڈھنگ ہے علم کے حاصل کرنے کا۔ اور بے ڈھنگا کام تو بے ڈھنگا ہی ہوتا ہے۔

آجکل تعلیم یافتہ اصحاب علم کا شوق رکھتے ہیں۔ اور بعض وقت دین کی کتابیں بھی دیکھتے ہیں، لیکن صحیح طریق سے نہیں دیکھتے۔ لہٰذا کوئی نتیجہ کارآمد اس سے نہیں نکلتا۔ صحیح طریقہ وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ تحصیل علم کے متعلق ایک بات اور بتلاتا ہوں جو نہایت ضروری ہے۔ گو اس کو تعصب کہا جائے گا مگر درحقیقت خیر خواہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مختلف مضامین اور مختلف مصنفین کی کتابیں نہ دیکھئے۔ آجکل یہ بھی ایک شوق ہے کہ جو کتاب ملی اسی کو دیکھنے لگے۔ خواہ وہ ہندو کی ہو یا عیسائی یا دہریہ کی ہو۔ نہ معلوم اس میں کیا مصلحت ہے، سوائے وقت ضائع کرنے کے۔ بعض وقت علم متضاد ہوتے ہیں تو اس تضاد سے مفید علم بھی فاسد ہو جاتا ہے۔ جیسے کھانا کھا کر سکھیا کھا لیا، کہ وہ نہ خود ہضم ہوتا ہے۔ دوسرے کھانے کو ہضم ہونے دیتا ہے بلکہ سب کو بگاڑ دیتا ہے اور سب زہریلا زہر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مختلف

کتابیں دیکھنے سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا، بلکہ شبہات پیدا ہو جاتے ہیں، اور تمام علم زہر بن جاتا ہے، اور قلب کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ ہم مختلف کتابیں اس واسطے دیکھتے ہیں کہ محقق ہو جائیں۔ کیونکہ تحقیق جب ہی ہوتی ہے کہ انسان متضاد چیزوں سے واقف ہو۔ مثلاً کسی نے ہمیشہ میٹھا حلوہ ہی کھایا ہے، وہ حلوے کی قدر کیا جانے؟ جب اس کو ایک دفعہ کڑوا ایلوا بھی کھلایا جائے تب اس کو قدر ہوگی کہ حلوہ ایسی اچھی چیز ہے۔ اسی واسطے کہا ہے "تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا"۔

میں کہتا ہوں بسم اللہ! آپ ضرور محقق بنئے مگر اس کا طریقہ یہ نہیں ہے، اس کا طریقہ بھی یہی ہے کہ پہلے اپنے علم یعنی علم دین کو مکمل کر لیجیے، اور اہل فن کی صحبت میں رہیے، اس کے بعد جس کی کتاب چاہے دیکھئے۔ سلف نے بھی یہ کام کئے ہیں جن کی کتابیں اس وقت تک موجود ہیں، جن کی بدولت علمِ کلام ایسا مکمل موجود ہے کہ قیامت تک کوئی مخالف دم نہیں مار سکتا۔ اور یہ تکمیل اس طرح ہوگی کہ معاش کو آگ لگائیے، طالب علم بنئے، میزان سے پڑھیے اور پوری تحصیل کیجئے۔ پھر کسی محقق کی صحبت میں بھی کچھ روز رہیے، اس طرح آپ محقق بن جائیں گے یہ طریقہ کچھ دین ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ ہر کام کی اور ہر فن کی حالت یہی ہے کہ سیکھنے اور محنت کرنے ہی سے آتا ہے۔ صرف بطورِ خود ایک دو کتاب دیکھ لینے سے نہیں آتا۔ غرض محقق بننا کچھ بُرا نہیں، مگر ہر کام کا طریقہ ہے۔ محقق بننے کا طریقہ وہ ہے جو میں نے بتایا۔ آجکل لوگوں کو شوق ہے کہ کام طریقہ سے تو کرتے نہیں، اور قدم رکھتے ہیں سب سے آگے۔

ایک کوتاہی علم کے متعلق یہ ہے کہ بعض بے علم مسلمان مناظروں میں گھس جاتے ہیں اور بعض وقت جہالت سے کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ پھر تو ان کا دماغ بہت ہی بڑھ جاتا ہے۔ ایک جگہ ایک عیسائی تقریر کر رہا تھا اس نے اثنارِ تقریر میں اعتراض کیا کہ دیکھو حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردہ کو زندہ کر دیتے تھے، اندھوں کو اچھا کر دیتے تھے، اس کے مسلم

بھی قائل ہیں۔ خود قرآن میں موجود ہے اور مسلمانوں کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسا نہیں کرتے تھے"، تو اس سے فضیلت ثابت ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ ایک آجکل کے سے محقق کھڑے تھے وہ اس عیسائی سے الجھ گئے اور کہنے لگے ہمارے حضورؐ کی تو بڑی شان ہے، ایسے کام تو میں کر سکتا ہوں وہ عیسائی اتفاق سے کھاتا تھا، کہنے لگا کہ مردہ کو زندہ کرنا تو بڑی بات ہے میری ایک آنکھ پھوٹی ہوئی ہے۔ اسی کو درست کر دو تو میں جانوں۔ اب ان کو کوئی علمی جواب تو آیا نہیں مگر تھے ذہین کہنے لگے" عیسیٰ علیہ السلام تو نبی تھے اور میں ہوں امتی۔ ان کی برابری کا دعویٰ گستاخی میں شمار ہوگا۔ ہاں اتنا کر سکتا ہوں کہ تیری دونوں آنکھیں یکساں کر دوں۔ اس طرح کہ دوسری کو بھی پھوڑ دوں"۔ بس اس پر مجمع میں ایک قہقہہ لگا اور عیسائی خاموش ہوگیا۔ غرض بعض وقت اس طرح جاہلوں کی نظر میں کامیابی بھی ہو جاتی ہے، مگر یہ کوئی کامیابی نہیں۔

ایک کوتاہی تحصیل علم کے متعلق یہ ہے کہ دین کے متعلق کوئی عام آدمی بھی سوال کرتا ہے تو دقیق سے دقیق مسئلہ کا سوال کرتا ہے، جس کے سمجھنے کی لیاقت نہیں۔ اور فرمائش یہ کی جاتی ہے کہ ہم کو تو سمجھا ہی دو۔ ایک انجینیر صاحب نے مجھ سے ایک مسئلہ علم بلاغت کے متعلق پوچھا۔ میں نے کہا" اس کا جواب سمجھنے کے لئے چند علوم کی ضرورت ہے"۔ کہنے لگے اچھا مجیب کا کمال ہی کیا ہوا؟ علوم پڑھنے کے بعد تو ہم خود ہی سمجھ لیں گے۔ سلیس عبارت میں آپ تقریر کر دیجئے میں سمجھ لوں گا۔ میں نے کہا جناب! اقلیدس اردو میں ہے، اور عبارت اس کی کیسی سلیس ہے، مگر اس کی ایک سہل سے سہل شکل کسی ایسے شخص کو سمجھا تو دیجئے جو اصول موضوعہ، اور علوم متعارفہ کو نہ جانتا ہو۔ مگر آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے، پھر آپ سے بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ کمال ہی کیا ہوا جو آپ نے ایسے شخص کو نہ سمجھایا جو علوم متعارفہ اور اصول موضوعہ کو نہ جانتا ہو۔ اور آپ انجینیر ہیں تعمیر کا کام بھی جانتے ہیں اگر ایک معمار آپ سے یہ کہنے لگے کہ جو کام آپ آلات سے کرتے ہیں وہ مجھے بلا آلات کے سکھا دیجئے تو کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں؟ یا آپ کو یہی کہنا پڑے گا کہ بھائی وہ کام آلات ہی پر موقوف ہے آلات منگا لو،

اوران کا استعمال سیکھ لو تب میرا سا کام کرسکو گے۔ اب انجینئر صاحب چپ تھے۔

بعضے حضرات اس موقع پر یہ بھی کہنے لگتے ہیں کہ اچھا صاحب ہمارا سوال حل کرنے سے پہلے ان علوم کو بھی سمجھا دیجئے۔ جن پر جواب کا سمجھنا موقوف ہے۔ مگر اس کے ساتھ فرمائش یہ بھی ہوتی ہے کہ "اسی وقت اور ایک ہی مجلس میں سب کام ہو جائیں اور ہم یہاں سے محقق بن کر اٹھیں"۔ میں پوچھتا ہوں کہ! اتنی جلدی کون سا کام ہو جاتا ہے، ایک ذرا سا امتحان آپ دینا چاہتے ہیں تو اس کی تیاری میں کتنے دن لگتے ہیں؟ حالانکہ وہ علم ہی کیا ہے جس کا آپ امتحان دینا چاہتے ہیں اور "علم شرائع" تو وہ علم ہے جو بڑے بڑے عقلاء کی سمجھ سے بالا ہے جس کے لئے حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا، اور عقل اس کے واسطے کافی نہ ہوئی بلکہ وحی کی ضرورت ہوئی۔ اب ایک اس علم کو لے لیجئے جو آپ کے ہم جنس انسانوں کا بنایا ہوا ہو۔ مثلاً پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے ان کو آپ کسی یونیورسٹی میں حاصل کرنے کے لئے جائیے اور یہی فرمائش کیجئے کہ وہ علوم ہم کو سکھا دو، اور یہی شرط کیجئے کہ اسی ایک جلسہ میں سکھا دو۔ دیکھیں کون سا پروفیسر ہے جو ایسا کر سکتا ہے۔ اگر کوئی ایسا کر سکتا ہے تو ہم بھی آپ کو ایک ہی جلسہ میں محقق بنا دیں گے۔

غرض یہ ناممکن ہے کہ ایک جلسہ میں، بلکہ ایک دن میں، بلکہ دو چار دن، اور دو چار مہینہ میں بھی محقق بنا دیا جائے۔ ہاں باقاعدہ طالب علمی کیجئے، اور سب کام چھوڑ کر علم کے پیچھے پڑ جائیے، ایک معتدبہ وقت میں آپ ضرور محقق بن جائیں گے۔ پھر آپ نہ صرف خود ان مسائل کو سمجھ لیں گے بلکہ اوروں کو بھی سمجھا سکیں گے۔ اور اگر اس طرح طالب علمی کرنے اور باقاعدہ علم پڑھنے سے کم فرصتی کا عذر ہے تو اس ہوس کو چھوڑ دیجئے، اور کسی محقق کا دامن پکڑ لیجئے اور جو وہ کہے اس کو تسلیم کیجئے۔ تمام فنون میں یہی طریقہ ہے۔

آپ کیسے ہی بڑے آدمی ہوں، اور کیسے ہی تعلیم یافتہ ہوں لیکن ڈاکٹر نہ ہوں اور آپ کا بچہ بیمار ہو تو آپ کو ڈاکٹر ہی کے پاس جانا پڑے گا اور جو وہ کہے گا وہی کرنا ہوگا۔

اس کے نسخہ کو آپ پڑھ بھی نہ سکیں گے مگر یہ نہ کہہ سکیں گے کہ ذرا سمجھا دیجئے کہ نسخہ کیا لکھا اور کس مرض کا لکھا ہے۔ اسی کا نام تو اتباع ہے۔ وہ ڈاکٹر اس وقت بمقابلہ آپ کے محقق ہے، آپ غیر محقق ہیں۔ اس واسطے اس کی ہر بات کو تسلیم ہی کرنا پڑے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ غیر محقق کو محقق کے اتباع سے چارہ نہیں۔ دنیا کے کاموں میں یہ سب کے نزدیک مسلم ہے۔ پھر دین کے کاموں میں کیوں مسلم نہیں۔ غرض یا تو محقق بنئے یا محقق کا اتباع کیجئے اور اس کے سامنے قیل وقال نہ کیجئے۔ میں یہ بھی بتادوں گا کہ محقق کس کو کہتے ہیں، اور وہ کیسے مل سکتا ہے۔ کوئی پہلو نہ چھوڑوں گا انشاء اللہ۔ مگر سب سے پہلے اس پندار کو دماغ سے نکال دیجئے کہ ہم محقق ہیں پھر محقق کی تلاش شروع کیجئے، اور عزم کر لیجئے کہ اگر کوئی محقق مل گیا تو ہم اس کی جوتیوں میں پامال ہو جائیں گے جس کو مولانا روم فرماتے ہیں ؎

پیش یوسف نازش وخوبی مکن جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

اس کے سامنے ناز سے کام نہیں چلتا، نیاز ہی سے کچھ کام چل سکتا ہے۔

اب میں محقق کے ملنے کا طریقہ بتلاتا ہوں۔ سو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو "غیر مکتسب" یعنی منجانب اللہ ایسا محقق مل گیا (اور عادۃ اللہ یہ ہے کہ طلب صادق پر اس کا ترتب ہو جاتا ہے، طلبِ صادق میں یہ اثر ہے کہ مطلوب مل ہی جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے "جوئندہ یابندہ" یہ مثل چاہے اور کسی کام میں صحیح ہو یا نہ ہو مگر اس طریق میں تو بالکل صحیح ہے خدا کا طالب خدا تک پہنچ کر رہتا ہے۔ بشرطیکہ طلب صادق ہو۔ طلب صادق خود مطلوب تک پہنچا دیتی ہے۔ عادت الٰہی یہی ہے اسی کے متعلق مولانا روم کہتے ہیں ؎

ہر کجا پستی است آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

اور ایک جگہ اس مضمون کو زیادہ کھول کر فرمایا ہے ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست　　تا بجوشد آبت از بالا و پست

تشنگان گر آب جویند از جہان　　آب ہم جوید بعالم تشنگان

دوسرے شعر میں وصول کا راز بتلایا ہے، وہ یہ کہ طلب صرف ادھر سے نہیں ہوتی بلکہ ادھر سے بھی ہوتی ہے۔ بلکہ اوّل ادھر سے ہوتی ہے، اگر ادھر سے نہ ہوتی تو ادھر توفیق طلب کی کیسے ہوتی۔ توفیق بھی تو ان ہی کے دینے سے ہوتی ہے۔ غرض طلب صادق مطلوب تک پہنچا دیتی ہے۔ گویا طالب صادق کو الہام ہوتا ہے کہ یہ کام فلاں محقق ہے۔ اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ طالب ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اس کا کام ہونے والا ہے۔

اور دوسری صورت "مکتسب" ہے وہ یہ کہ جتنے مشائخ و علماء اس وقت مشہور ہیں ان سب کے پاس خالی الذہن ہو کر چند روز رہ کر دیکھو، اس سے ضرور حق واضح ہو جائے گا۔ اب میں کہتا ہوں کہ اگر اس طرح محقق مل گیا اور تردد باقی نہ رہا تو بس محقق متعین ہو گیا اب اس کے پاس رہو یا نہ رہو مگر اس کا اتباع کرو، اس محقق کے سامنے چون وچرا نہ کرو حتّٰی کہ بدون اس کے اذن کے کتاب بھی مت دیکھو، صرف اس کو دیکھو، اس کے اقوال کا اور اس کے افعال کا اتباع کرو، خوب کہا ہے ؎

در مصحف روئے او نظر کن　　خسرو غزل و کتاب تا کے

دیکھئے! آپ مقدمہ لڑانے عدالت میں جاتے ہیں تو جو "وکیل" بلکہ وکیل کا "محرر" کہتا ہے وہی کرنا پڑتا ہے۔ حتّٰی کہ کاغذ پر دستخط بھی اگر بے موقع کر دیئے ہیں تو وہ دوسری جگہ دستخط کراتا ہے۔ آپ کی اتنی بھی مجال نہیں ہوتی کہ اس سے پوچھیں کہ اس جگہ دستخط کرنے میں کیا خرابی تھی، جو دوسری جگہ دستخط کراتے ہو۔ اس معنی کر کہا ہے ؎

جملہ اوراق وکتب درنار کن　　سینہ را از نورِ حق گلزار کن

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کتابیں غلط ہیں۔ پڑھنا لکھنا نہیں چاہیئے۔ جیسے بعض جاہل اس کا مطلب یہی لے لیتے ہیں کہ پڑھنے لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس کودا اچھلا کرو اور جو چاہو کرتے رہو۔ اور کیسے ہی بُرے سے بُرے افعال اور گناہ کرو کچھ حرج نہیں۔ اور جب کوئی اعتراض کرے تو یہی پڑھ دو۔

ع　جملہ اوراق وکتب درنار کن۔

بہت سے جاہل پیر ایسے ہی پھرتے ہیں جو الف کے نام بے بھی نہیں جانتے، اور خود بھی گمراہ ہیں اور اوروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ جو چاہیں کرتے پھرتے ہیں اور یہی جملہ ان کا متمسک ہے ع　جملہ اوراق و کتب درنار کن

میں کہتا ہوں کہ اگر اس پر عمل ہے تو آپ کے یہاں دنیا کے بھی تو کچھ کاغذات ہوں گے مثلاً بیع نامے۔ تمسک رہن نامے وغیرہ سب کو ایک دم آگ میں جھونک دو۔ غرض اس جملہ کا یہ مطلب نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی محقق تم کو مل جائے تو اس سے کچھ حاصل کرنے کے لئے کچھ عرصے کے واسطے اس طرح اس پر عمل کرو کہ جو وہ کہے اس کے مقابلہ میں کتاب پیش مت کرو۔ اس سے کسی بات میں معارضہ مت کرو۔ جو وہ کہے آمنا وصدقنا کہہ کر تسلیم کرو۔ اس کا راز یہ ہے کہ کتاب تو غلط نہیں ہے لیکن تمہاری سمجھ غلط ہے اگر تم میں کتاب سمجھنے کی لیاقت ہوتی تو تم کو محقق کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جب تم میں اتنی لیاقت نہیں جب ہی تو اس کے پاس گئے ہو، پھر اس کے سامنے لیاقت بگھارنا اپنے افعال میں تعارض ہے چند روز اسی طرح اس کے اقوال کو تسلیم کرو پھر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ جو وہ کہتا ہے وہ ہی کتاب کہتی ہے۔ اور جو تم سمجھتے تھے وہ غلط تھا۔ مگر ابتداء میں کتاب پر اعتماد کرنا، اور

اس کے قول پر اعتماد نہ کرنا، یہ زہر قاتل ہے۔ اور اس کا نتیجہ سوائے گمراہی اور محرومی کے کچھ نہیں۔ نیز اس کی صحبت میں بہت سی باتیں وہ بھی دیکھو گے جو تصریحاً کتاب میں نہیں ملیں گی۔ اس کو اس طرح سمجھ لینا کہ ایک شخص گانا سیکھنا چاہتا ہے تو علم موسیقی کا استاد جس طرح کہے اور جس طرح خود آواز نکال کر بتلائے اسی کی تقلید کرنی پڑے گی تب تو گانا آئے گا۔ اور اگر کوئی موسیقی کی کتاب ہاتھ میں لے کر استاد پر اعتراض کرنا شروع کر دے کہ استاد! یہ تال آپ کی "کتاب" کے خلاف ہے اور یہ سُر آپ کا "کتاب" کے خلاف ہے تو اس کو گانا کبھی نہیں آئے گا۔ ہاں اگر استاد کا پورا اتباع کیا، اور اس کے کہنے سے اس کے گانے کی نقل بے سوچے سمجھے اتاری، تو چند ہی روز میں گانا آجائے گا۔ اور یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ استاد جو بتاتا تھا وہ سب "کتاب" کے موافق ہی تھا۔

باقی محقق کے لئے صاحب کشف اور صاحب تصرف ہونا لازم نہیں۔ جیسا آجکل یہ بھی ایک خبط ہے اور اسی کو معیار کمال، محقق، اور کامل کی پہچان قرار دے رکھا ہے کہ جس کے پاس بیٹھو اور کشف ہونے لگے اور کلکتہ، بمبئی، اور سمندر نظر آنے لگے کامل ہے۔ اور جس کی صحبت میں یہ بات حاصل نہ ہو اس کو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ یہ ایسی غلطی ہے کہ بہت سے لکھے پڑھے اس میں مبتلا ہیں۔ اور بہت سے آدمی اس کشف وکرامت کی بدولت گمراہ ہو چکے ہیں۔ کسی نے تصرف سے خواب میں اپنی حقانیت دکھا دی، کسی نے تصرف سے کلکتہ کی سیر کرا دی، بس اسی کے پیچھے ہو لئے، ایمان تک کی بھی پرواہ نہ رہی۔ کلکتہ چیز ہی کیا ہے بلکہ ساری دنیا کیا چیز ہے، جو چیز "محقق" سے حاصل کرنے کی ہے وہ تو چیز ہی اور ہے وہ چیز کیا ہے "وصول الی اللہ" یعنی حق تعالیٰ کا پہنچنا۔ حق تعالیٰ کو پہچاننا۔ جب حق تعالیٰ کو پہچانو گے تو دنیا کو کیا اپنے آپ کو بھی بھول جاؤ گے۔ اور یہ چیز کسی گمراہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ باقی کشف وکرامت تصرفات، اور شعبدے ہر قسم کے آدمی سے ہو سکتے ہیں بہت سے "جوگی"، بہت سے "مسمریزم والے"، بہت سے "شعبدے باز" ایسی چیزیں

دکھلا سکتے ہیں جو سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ ان چیزوں کے لئے حق پر ہونا شرط نہیں اور وصول الی اللہ کے لئے حق پر ہونا شرط ہے۔ اور اسی کے لئے محقق کی تلاش کی ضرورت ہے غرض جب ایسا محقق مل جائے تو پھر، وہ جس راہ پر چلائے اسی راہ چلو، اس کے سامنے لِمَ کَیْفَ اور چون و چرا نہ کرو۔ کیونکہ وہ تم کو ایسی راہ پر لے جارہا ہے جس کو تم نہیں چاہتے پھر ایسی بات میں دخل دینا جس کو تم نہیں جانتے کیسے درست ہوسکتا ہے؛ بلکہ اس کے ہاتھ میں" کَالْمَیِّتِ فِیْ یَدِ الْغَسَّالِ ۔ "، مثل مُردہ کے نہلانے والے کے ہاتھ میں ۱۲ ہوجاؤ۔ اور جو تصرف تمہارے اندر کرے کرنے دو۔ چند روز میں ثابت ہوگا کہ اس کے تصرف سے تم کو کیا نفع پہنچا۔ اور اس صورت کے متعلق میں ایک ضروری بات یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ جس کو ایسا "محقق" مل گیا ہو اور تردد نہ رہا ہو اس کو ایک ہی کو اختیار کر لینا چاہیئے۔ اس کو دوسری طرف نظر اٹھانا جائز نہیں۔ اسی میں متفرق کتابوں کا دیکھنا بھی داخل ہے۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ مختلف کتابوں کے دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ اگر کہیں کوئی مضمون غلط اور مضر ہوگا تو اس کی اصلاح ہم اپنے محقق سے کرلیں گے۔ میں کہتا ہوں! یہ ایسا ہے جیسے انگلی آگ میں جلا لینا، اس اعتماد پر کہ ہمارے پاس ایک مُجرَّب مرہم ہے وہ لگالیں گے، اس کو کون عقلمند پسند کرے گا؟ کہ پہلے انگلی کو جلالو پھر مرہم لگاؤ۔ بیوقوف سے بیوقوف بھی یہی کہتا ہے کہ آگ سے بچتے رہو اسی طرح یہ کون سی عقلمندی ہے؟ کہ ایک مضر کتاب دیکھو پھر اس سے جو نقصان پہنچے اس کی اصلاح کے لئے دوسری کتاب تلاش کرو یا شیخ اور محقق کو دق کرو۔ یہی کیوں نہ کرو کہ ایسی کتاب ہی نہ دیکھو۔ شیخ کے پاس رہ کر اور ہی کام بہتیرے ہیں وہ کرو۔

مرہم پٹی پر ایک قصہ یاد آیا! کوئی سرحدی پٹھان ہندوستان آئے تھے، ان کے بدن پر زخم ہوگئے۔ کسی نے ان کا علاج کیا اور مرہم پٹی کی وہ اچھے ہوگئے۔ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ" بھائی تم ہمارے یہاں آئے گا تو ہم تم کو اس کا بدلہ دے گا ہم تم سے

بہت خوش ہے۔" یہ ہندوستانی اتفاقاً ان کے ملک میں پہنچے، اور تلاش کرتے کرتے مکان پر بھی پہنچ گئے۔ خان ملے، بہت خوش ہوئے اور کھانا کھلایا، ٹھہرایا۔ پھر کہا بھائی! تم بیٹھئے گا، ہم تمہارے احسان کا بدلہ دے گا۔ ہم ابھی آتا ہے۔ یہ کہہ کر خان کہیں کو گئے یہ مہمان سمجھے کوئی توڑا روپوں کا لاکر دے گا۔ خوشی خوشی بیٹھے رہے۔ خان کی بیوی نے کہا کہ "ارے کم بخت کیوں تری موت آئی ہے، وہ چھرا لینے گیا ہے، وہ تجھے زخمی کرے گا، پھر ان زخموں کا علاج کرے گا، جیسے تو نے زخموں کا علاج کیا تھا۔ کیونکہ وہ کہا کرتا تھا، کہ اگر وہ یہاں آیا تو میں یہی کروں گا۔" یہ حضرت وہاں سے بدحواس ہوکر بھاگے، اور چھپ چھپا کر اپنی جان بچاکر نکل آئے۔

یہ بُری کتابوں کا دیکھنا پھر اس کی اصلاح کرنا ایسی ہی حماقت ہے جیسے اس سرحدی نے تجویز کی تھی۔ بالفرض اگر کچھ مضر بھی نہیں ہے، تو کم ازکم تضییع وقت تو ہے ہی۔ محقق کے پاس رہ کر وہ کام کیجئے جو اس کے پاس رہ کر کرنے کے ہیں۔ یہ وقت پھر نہیں ملے گا دوسرے مضر یا فضول اشغال میں اپنا وقت، پھر ان کی اصلاح میں اس کا وقت ضائع نہ کیجئے۔ اگر ایسا ہی کتب بینی کا شوق ہے تو اسی محقق سے پوچھ لیجئے کہ میں فلاں کتاب دیکھنا چاہتا ہوں، اگر وہ اجازت دے تو دیکھئے، ورنہ نہیں، غرض اس سے ایسا تعلق رکھئے کہ نرم گیر و سخت گیر دخوش بگیر۔ اسی طرح اس سے اپنا کوئی عیب مت چھپاؤ اور ان عیبوں کی اصلاح کے لئے جو وہ کہے وہ کرو وہ تمہارے عیبوں کی ایسی اصلاح کر دے گا جیسے صابن میلے کپڑے کی اصلاح کر دیتا ہے۔

بعض لوگوں کو اپنا عیب ظاہر کرتے عار آتی ہے۔ میں کہتا ہوں پھر اصلاح کیسے ہوگی شیخ پر ظاہر کر ہی دینا چاہیئے۔ یہ بھی اطمینان رکھئے کہ وہ بدتہذیب نہیں ہے، وہ آپ کے عیبوں کو گاتا نہیں پھرے گا، بلکہ دل سے اور للہیت کے ساتھ ان کی اصلاح کرے گا۔ اور بدون اس کے یعنی بلا عیبوں کو ظاہر کئے ہوئے ہرگز امید نہ رکھئے کہ اصلاح ہو سکے گی۔

بلکہ اگر وہ تمہارے عیبوں کو دوسروں کے سامنے ظاہر بھی کر دے تو سمجھ لو کہ اسی میں تمہاری مصلحت ہو گی یہ ایسا ہے جیسے ڈاکٹر کہے کہ اس مرض کا اپریشن دھوپ، ہوا کھلی جگہ میں ہو گا۔ تو اگر اس سے علاج کرانا، اور صحت کا حاصل کرنا منظور ہے تو یہی کرنا پڑے گا اور حیا اور شرم کو بالائے طاق رکھنا ہو گا۔ اسی طرح شیخ کے سامنے عار کو چھوڑ دو، اور اس کی ہر تجویز کو اپنے واسطے مفید سمجھو، اور مکدر مت ہو۔ جو کچھ تکلیف پہنچے وہ برداشت کرو اس میں اپنی رائے کو دخل دو گے، اور مکدر ہو گے تو نفع نہ ہو گا۔ اور شیخ کے پاس جانا بیکار ہو گا۔

مثنوی میں ایک قصہ قزوینی کا لکھا ہے! کسی زمانہ میں ان میں گدوانے کا رواج تھا۔ اور لوگ اپنے جسم پر تصویریں بنوایا کرتے تھے۔ ایک قزوینی ایک گودنے والے کے پاس پہنچا اور فرمائش کی کہ میری کمر پر "شیر" کی تصویر بنا دے۔ اس نے کہا اچھا، اور کمر کھول کر کام کرنا شروع کیا۔ پہلے دم کی طرف سے تصویر بنانی چاہی، ایک سوئی کچ سے چبھوئی، اس نے کہا یہ کیا کرتے ہو؟ کہا شیر کی دم بناتا ہوں۔ اس نے کہا میاں! دم کو جانے دو لنڈورے شیر بھی تو ہوتے ہیں اس نے کہا اچھا۔ اب اس نے سر بنانا چاہا، پھر سوئی کچ سے چبھوئی۔ اس نے کہا اب کیا کر رہے ہو؟ کہا شیر کا سر بناتا ہوں۔ کہا میاں! یہ شیر سچ مچ کا تھوڑا ہی ہے یہ کیا کچھ کھائے پیئے گا جو منہ اور سر بناتے ہو۔ منہ اور سر کو رہنے دو۔ گودنے والے نے پیٹ بنانا چاہا تو پھر سوئی چبھوئی۔ پھر یہ چیخ اٹھے اور کہا کیا کر رہے ہو؟ کہا پیٹ بناتا ہوں۔ کہا جب اس کو کھانے پینے کی ضرورت نہیں تو پیٹ کی بھی کیا ضرورت ہے۔ غرض جب وہ گودنے والا شیر کا کوئی عضو بنانا چاہے تو یہ چیخنے لگیں۔ تو اس نے جھلا کر کہا کہ شیر بنوانے کو آئے ہو۔ اور کوئی عضو بنانے نہیں دیتے، تو میں کیا چیز بناؤں؛ شیر تو آخر چند اعضا ہی کے مجموعے کا نام ہے، جب تم کوئی عضو ہی نہیں بنا دیتے تو پھر شیر بنوانے ہی کے کیا معنی؛ ایسا شیر تو بھائی مجھ سے بنانا نہیں آتا، جس کے نہ دم ہو، نہ سر۔ منہ ہو، نہ پیٹ،

ہاتھ پاؤں ہوں نہ ناک کان ہے

شیر بے گوش و سر و اشکم کہ دید　　این چنین شیرے خدا ہم نا فرید

اس پر مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

چون نداری طاقت سوزن زون　　پس تو از شیر ژیان کم دم بزن

یہی حالت ان لوگوں کی ہے جو اصلاح کرانے کا تو دم بھرتے ہیں، اور جب ان کو روک ٹوک کی جاتی ہے تو مکدر ہوتے ہیں۔ اور بات بات پر حجت کرتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے اس میں کیا حرج ہے۔ حرج کو تم جانتے ہو یا تمہارا مُصلح۔ اگر تم خود ہی حرج کو جانتے ہو تو پھر مُصلح کے پاس کیوں آئے ؛ جب مصلح کے پاس آئے ہو تو اپنی رائے کو چھوڑو ؎

چون گزیدی پیر ہین تسلیم شو　　ہمچو موسی زیر حکم خضر رو

در بہر زخمے تو پُر کینہ شوی　　پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

خوب سمجھ لو کہ اگر قیل و قال رہے گی تو بس تم جیسے تھے ویسے ہی رہو گے۔ اپنا وقت بھی خراب کرو گے اور مصلح کا بھی۔ دیکھو! آئینہ کو کتنا رگڑا جاتا ہے تب اس میں جلا پیدا ہوتی ہے چاہیئے تو یہ کہ اگر وہ تمہاری رعایت کرے، اور نرمی کرے، تو فرمائش کرو کہ رعایت نہ کیجئے کام پورا کیجئے۔ ڈاکٹر جب اپریشن کرتا ہے تو اسی کو اچھا سمجھا جاتا ہے، اور اسی کی فرمائش کی جاتی ہے کہ پورا کام ہو جائے، کچھ کسر باقی نہ رہ جائے۔ اسی طرح روحانی اپریشن کو سمجھ لو؟ اس میں بھی یہی فرمائش ہونا چاہیئے کہ پورا کام ہو، رعایت اور نرمی نہ کی جائے۔ خیر اگر یہ فرمائش بھی نہ ہو تو کم سے کم یہ تو ہونا چاہیئے کہ اس کے مجوزہ تصرفات پر راضی رہیں۔

خوب سمجھ لیجئے کہ محقق، مصلح، بالکل باپ ہے، اور بالکل مان ہے۔ یعنی مان ہے شفقت میں، اور باپ ہے عقل میں۔ مان ہر وقت اسی فکر میں رہتی ہے کہ میرا بچہ تندرست رہے موٹا تازہ رہے، اور جلدی جلدی بڑا ہو جائے۔ اور باپ یہ چاہتا ہے کہ بچہ علم و ہنر سیکھے

ترقی حاصل کرے۔ اسی طرح مصلح مان کی طرح ہر وقت یہ چاہتا ہے کہ طالب کو فائدہ پہنچے اور باپ کی طرح ہر وقت یہ چاہتا ہے کہ طالب کی اصلاح ہو جائے، نفس و شیطان سے بچا رہے، اور آخرت کی ترقی حاصل کرے۔ پھر ایسے ہمدرد کا کہنا ماننا چاہیئے یا مخالفت کرنا چاہیئے؟ اس سے تو کسی قسم کا خطرہ نہیں رکھنا چاہیئے وہ جو کچھ کہے گا ہمدردی سے کہے گا۔

غرض محقق پیر مل جائے تو غنیمت سمجھو، اور اس کی صحبت کو اکسیر اعظم سمجھو۔ اور اپنے آپ کو عمر بھر کے لئے اس کے سپرد کر دو، اور اس سے کسی امر میں قیل و قال مت کرو، اور اس کے کسی فعل میں بدگمانی بھی نہ کرو۔ بہت سے افعال اس کے ایسے ہوں گے جو تمہاری سمجھ میں نہ آئیں گے۔ اس وقت جلدی مت کرو، بلکہ دیکھتے رہو، بعد میں اس کا راز کھل جائے گا۔ ہاں اگر کوئی امر خلاف شریعت کرے تو اور بات ہے، لیکن اس میں بھی جلدی نہ کرو۔ حتی الامکان محل صحیح پر اس کو محمول کرو۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تو چندے انتظار کرو۔ ہاں اگر بار بار خلاف شریعت اس سے صادر ہو، اور کوئی تاویل بھی نہ ہو سکے تو اس سے علیحدہ ہو جاؤ یعنی اس پیر کو چھوڑ دو۔ مگر اس صورت میں بھی اس کے ساتھ گستاخی نہ کرو۔ یہ ہیں آداب شیخ۔ اور اس طریق میں ادب بھی ایک چیز ہے، بلا اس کے ایک قدم چلنا ناممکن ہے۔

یہ اس صورت میں ہے کہ کسی کو محقق پیر مل جائے اور تردد نہ رہے۔ مگر ایک آزاد جماعت وہ بھی ہے، جو سمجھتے ہیں کہ کس کا اتباع کریں۔ محقق ملتا ہی نہیں۔ یہ شکایت آجکل اکثر زبانوں پر ہے۔ کہ ہم کس کی پیروی کریں؟ علماء اور مشائخ میں خود اختلاف ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ اور بعض لوگ تو اس کے متعلق بہت ہی دریدہ دہن ہیں اور جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں کہ سب کو چھوڑو اس غم ہی کو مت پالو۔ ان حضرات سے میں یہ عرض کرتا ہوں، کہ اختلاف کس چیز میں نہیں ہے؟ دنیا کی کوئی چیز بھی اختلاف سے خالی نہیں۔ معاملۂ علاج ہی کو لے لیجئے کہ جس ڈاکٹر کے پاس جاؤ، جس حکیم کے پاس جاؤ

لہ منہ پھٹ

اس کی تشخیص الگ، تجویز الگ، دوائیں الگ، بلکہ خود طبیبن بھی الگ الگ ہیں۔ فروع تو فروع اصول بھی الگ الگ ہیں۔ کسی طب میں علاج بالضد ہے۔ کسی میں علاج بالمثل۔ غرض اتنا اختلاف ہے کہ خدا کی پناہ۔ مگر ہم کسی کو نہیں دیکھتے کہ اس اختلاف سے یہ نتیجہ نکالے کہ ڈاکٹروں اور طبیبوں کو مطلقاً چھوڑ دے، اور بیماری میں علاج ہی نہ کرے۔ بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ ذرا سی پھانس بھی لگ جائے یا خفیف ساز کام بھی ہو جائے تو ڈاکٹر اور حکیم کی تلاش ہوتی ہے۔ اور اختلاف اطبار سے متاثر نہیں ہوتے، اور یہ نہیں کرتے کہ کسی کا بھی علاج نہ کریں۔ خود کو اپنے ہی حال پر چھوڑے رکھیں۔ بلکہ ڈاکٹر اور طبیب کو ڈھونڈتے ہیں، اور یہ کام بھی کسی اناڑی اور عطائی سے نہیں لیتے بلکہ اس کے لئے بھی ہوشیار اور کارکردہ معالج کو تلاش کرتے ہیں، اور کوئی نہ کوئی مل جاتا ہے۔ ایک پھانس کے لگ جانے میں تو یہ حالت ہوتی ہے۔ اور دین کے بارہ میں یہ حکم لگا دیا کہ چونکہ علمار میں اختلاف ہے لہٰذا سب کو چھوڑ دو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک دین اتنا بھی مہتم بالشان نہیں جتنی ایک پھانس کا لگنا مگر ان لوگوں کو چھوڑیئے اس وقت ان سے خطاب نہیں۔ ان کی نسبت تو بس یہ کہنا کافی ہے سہ

فسوف تری اذا انکشف الغبار　　　افرس تحت رجلك ام حمار

آنکھ بند ہوتے ہی معلوم ہو جائے گا کہ تمام عمر کس خبط میں گزر گئی، جس کا اب کچھ تدارک نہیں ہو سکتا اس وقت خطاب ان لوگوں سے ہے، جو دین کی پرواہ رکھتے ہیں۔ اور محقق مصلح کی تلاش بھی کرتے ہیں۔ مگر طریقہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے، یا کسی اور وجہ سے ان کا تردد رفع نہیں ہوتا ایسے لوگوں کو میں مقصود کے پانے کا طریقہ مکرر بتاتا ہوں، اور وہ وہی ہے جو اوپر قریب ہی بیان کر چکا ہوں۔ کہ چند جگہ کا انتخاب کرو کیونکہ دنیا خالی نہیں، نہ کبھی خالی ہوگی۔ پھر تھوڑا وقت اور تھوڑا پیسہ خرچ کرو، اور ہر ہر جگہ ایک ایک ہفتہ رہو۔ مگر یہ شرط ہے کہ "خالی الذہن ہو کر رہو، نہ کسی کے معتقد ہو، نہ مخالف، اور وہاں کی ہر ہر حالت میں غور کرتے رہو۔ دن بھر وہاں کے حالات دیکھو، اور باتیں سنو، اور رات کو غور کرو اور سوچو" اگر طلب صادق ہے

توحق واضح ہو جائے گا اور صاف معلوم ہو جائے گا کہاں مصری ہے کہاں تنکے کہیں تصنع اور بناوٹ ملے گی، کہیں جعل سازی اور فریب ہوگا، کہیں پیران نمی پرند و مریدان می پرانند کا ظہور ہوگا۔ مگر کہیں سچی اور کھری بات بھی ہوگی۔ اگر طلب میں خلوص ہے تو کھرے کھوٹے میں تمیز کر لینا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ اس طریق سے کوشش کرو، اور حق تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہو۔ صرف اپنی کوشش پر بھروسہ نہ کرو۔ ہدایت حق تعالیٰ کے کرم پر موقوف ہے، اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ عجز و نیاز ہی ہے۔ دعا کا مغز یہی "عجز و نیاز" ہے کوئی اپنے علم فہم و ذہانت سے ہدایت نہیں پاتا ہے۔ بڑے بڑے عقلا گمراہ ہو چکے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔ ہدایت جس کو ہوئی ہے حق تعالیٰ کے فضل ہی سے ہوئی ہے۔ اس واسطے کوشش کے ساتھ عجز و نیاز و دعا کی بھی سخت ضرورت ہے۔ یہ طریقہ ہے حق کے حاصل کرنے کا، اس سے ضرور حق مل جاتا ہے۔

یہاں تک الحمدللہ اکثر طبقات کی اصلاح کے طریقے بیان میں آ گئے اب صرف ایک فرقہ وہ رہ گیا جن کو نہ علم ہے، نہ فرصت ہے، نہ ہمت۔ اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا سے زیادہ ضروری دین ہے۔ جس کو ہر مسلمان مانتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ دنیا کے لئے علم بھی حاصل کر لیا جائے اور فرصت بھی نکال لی جائے، اور ہمت بھی پیدا ہو جائے۔ اور دین کے لئے کچھ بھی نہ ہو سکے۔ مگر خیر میں کسی درجہ میں ان کے ان عذروں کو قبول ہی کئے لیتا ہوں۔ اور ان کے لئے بھی طریقہ اصلاحِ قلب کا بتاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ کسی اہل علم سے ایک نصاب تجویز کرایا جائے، جس میں ضروریاتِ دین ہوں، اور تمام اجزاءِ دین کا بیان ہو، عقائد کا بھی، اور عبادات کا بھی، اور معاملات کا بھی، اور معاشرات کا بھی، اور اخلاق کا بھی۔ مگر عام فہم اور سلیس ہو۔ علمی نکات اور دقیق باتیں اس میں نہ ہوں۔ پھر یہ ناخواندہ لوگ اس کو سنا کریں، اور سننا بھی روزمرہ نہیں صرف ہفتہ میں ایک بار، اس طرح کہ سب لوگ جمع ہو جایا کریں، اور گھنٹہ آدھا گھنٹہ کوئی پڑھ کر سنا دیا کرے۔ اور سنانے کے لئے بیا تو ایک آدمی

مستقل رکھ لیا جائے جس کے لئے بڑی تنخواہ کی ضرورت نہیں۔ پانچ۔ سات روپیہ میں ایسا آدمی مل سکتا ہے، جو معمولی اردو پڑھ سکے وہ کافی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کھاتے پیتے لوگ اپنے گھر طبیب کو نوکر رکھتے ہیں تاکہ کنبہ کی بچوں کچھوں کی، اور محلہ کی، بلکہ قصبہ کی صحت کی نگرانی رکھے۔ یہ جسمانی طبیب ہے۔ اسی طرح محلہ میں یا قصبہ میں، ایک روحانی طبیب بھی رہے جو اصلاح دین کرتا رہے تو کیا حرج ہے۔ بلکہ روحانی طبیب کی ضرورت تو جسمانی طبیب سے بھی زیادہ ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ اگر پانچ سات روپیہ بھی نہیں جمع ہو سکتے اور مستقل آدمی اس کام کے لئے نہیں رکھ سکتے تو مسجد کے امام ہی کے ذمہ یہ خدمت کر دو کہ ہفتہ میں ایک دن وہ تجویز کردہ کتابیں سنایا کریں اور تم سب لوگ بیٹھ کر سنا کرو۔ اور وقت بھی اگر دن کا نہ ملے تو رات کو سہی بعد نماز عشاء فرصت کا وقت ہوتا ہے۔ ہفتہ میں ایک دن یہ وقت بجائے حقے بجانے کے دین کے کام میں صرف کرو۔ ہاں اتنا اور کہتا ہوں کہ جو کتاب سنائی جائے اس میں ترغیب و ترہیب بھی ہو۔ یعنی نیک اعمال پر ثواب کا بیان، اور گناہوں پر عذاب کا بیان ہو۔ اس کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ یہ وہ تدبیر ہے جس سے کوئی اُمّی آدمی بھی نادانف نہیں رہ سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دین کا خیال ہو۔

دنیا کے لئے کیا کیا محنتیں اٹھائی جاتی ہیں، دین کے لئے کچھ تو کرنا چاہیئے۔ اس سے زیادہ کیا سہولت ہو سکتی ہے۔ کہ ہفتہ میں ایک دن تھوڑا سا وقت نکال لیا جائے۔ رہیں عورتیں تو ان کے لئے اور بھی سہولت ہے، وہ یہ کہ جو باتیں مرد باہر سنیں وہ گھر میں جاکر عورتوں کو سنا دیا کریں۔ نہ اس میں ڈولی کا خرچ ہے نہ کسی گھر بار کے کام کا حرج ہے۔ گھر میں وہ باتیں سناتے وقت بچوں کو بھی بٹھا لینا چاہیئے۔ بچوں کے کان میں جو بات پڑتی ہے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتی ہے۔ البتہ اس کے ساتھ ذرا سی نگرانی کی بھی ضرورت ہے، وہ یہ کہ اس کا خیال رکھا جائے کہ گھر والے جو کچھ سنتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں یا نہیں، تو خود بھی عمل کرو اور گھر والوں سے بھی عمل کراؤ۔ یہ طریقے ہیں اصلاح کے۔

واللہ! اگر مسلمان چاہیں اور ان کو دین کا خیال ہو تو دین اس سہولت سے حاصل ہو سکتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام بھی اس سہولت سے پورا نہیں ہو سکتا، اس سہولت کا خلاصہ یہ ہے، کہ مرد ہفتہ میں ایک دن جمع ہو کر دین کی کتابیں سنیں، اور گھر جا کر عورتوں کو سنائیں کوئی مسئلہ پیش آئے تو علماء سے پوچھ لیں۔ اگر یہاں حل نہ ہو تو ڈاک کا راستہ کھلا ہوا ہے، جہاں سے چاہیں ایک ہفتہ کے اندر جواب منگا سکتے ہیں۔ گھر بیٹھے مولوی بن سکتے ہیں۔ اور جبکہ کچھ کرنا ہی نہ چاہیں اور دین کی ضرورت ہی ذہن میں نہ ہو تو پھر دنیا میں اس کا کچھ علاج نہیں۔ اس کا علاج تو بس آنکھ بند ہونے کے بعد ہوگا۔

یہاں تک تو علم کے حصول کی تدبیریں بیان کی گئی ہیں۔ دوسری چیز تھی "ہمت" سو وہ فعل اختیاری ہے، اس میں اختیار کے صرف کرنے کی ضرورت ہے، کسی خاص تدبیر کی ضرورت نہیں۔ جیسے کھانا کھانا، کہ سامنے کھانا رکھو، ارادہ کرو، ہاتھ سے لقمہ اٹھاؤ، منہ میں رکھو، دانتوں سے چباؤ، اور نگل جاؤ۔ پیٹ بھر جائے گا۔ اس میں کسی مستقل تدبیر کی کیا ضرورت۔ البتہ اگر قوت اختیاریہ کو ہی صرف نہ کرو تو کھانا اگرچہ سامنے رکھا ہے مگر پیٹ میں ہرگز نہ جائے گا، اور نہ پیٹ بھرے گا۔ غرض ہمت کی روح صرف قصد ہے، جو تدبیر سے مستغنی ہے۔ مگر میں تبرعاً اس میں بھی سہولت کے طریقہ بتائے دیتا ہوں، جس سے "وہ سہولت" اور مزید سہولت ہو جاوے۔

سو ایک طریقہ تو ہمت حاصل ہونے کا صحبت ہے۔ یعنی کسی کے پاس رہنا یہ عجیب چیز ہے۔ کیسا ہی کم ہمت آدمی ہو، لیکن جس فن کے آدمی کے پاس بیٹھے اس سے اس فن کی رغبت، اور اس سے مناسبت اور ہمت عادۃً پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ اچھے آدمی کے پاس بیٹھے تو اچھی باتوں کی رغبت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے، اور برے آدمی کے پاس بیٹھے تو برائیوں کی رغبت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر آدمی عقلمندوں میں رہے تو عقلمندی آجاتی ہے، بیوقوفوں میں رہے تو بیوقوف ہو جاتا ہے۔ عورتوں میں رہے تو زنانہ پن آجاتا

ہے۔ سپاہیوں میں رہے تو مردانگی، اور جرأت پیدا ہوتی ہے۔ اپاہجوں میں رہے تو اپاہج پن پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ بس جس میں ہمت نہ ہو دین کے حاصل کرنے کی اس کو چاہیئے کہ دینداروں کی صحبت اختیار کرے! اور کچھ دیر کو ان کے پاس جا بیٹھا کرے۔ ہمت پیدا ہو جائے گی۔ یہ تدبیر ہے ہمت پیدا ہونے کی۔

اب لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ پوچھتے ہیں کہ کوئی ایسا وظیفہ بتا دو جس سے نماز کی اور دین کی ہمت پیدا ہو جائے۔ صاحبو! ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے ہمت پیدا کرنے کا طریقہ وظیفے پڑھنا نہیں ہے بلکہ اس کا طریقہ صحبت اختیار کرنا ہے۔ اس پر بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اللہ کے نام میں بڑا اثر ہے کیا تم اللہ کے نام میں اثر ہونے کے قائل نہیں۔ پس وظیفوں سے کیوں ہمت پیدا نہ ہوگی۔ میں کہتا ہوں تم اللہ کے نام میں بے سمجھے بڑا اثر ہونے کے قائل ہو تو کھانا مت کھاؤ۔ کوئی وظیفہ پڑھ لیا کرو پیٹ بھر جایا کرے گا۔ بات یہ ہے کہ افعال اختیاریہ میں بلا قوت اختیاریہ صرف کئے کام نہیں ہوتا۔ اور قوت اختیاریہ صرف کرنے کا ارادہ پیدا ہونے میں آسانی ہونے کا موثر ذریعہ صحبت ہے۔ باقی ذکر اور وظیفے بھی اس میں معین ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہر چیز کا ایک درجہ ہوتا ہے۔ ذکر کا صحبت کے ساتھ وہی درجہ ہے جو مدد کا مسہل کے ساتھ۔ بعضے مرض کا علاج مادہ کے تنقیہ کرنے سے ہوتا ہے۔ اس لئے مسہل دیا جاتا ہے۔ مثلاً سنا، یا املتاس وغیرہ پلایا جاتا ہے لیکن اگر کبھی مسہل کا پوری طرح عمل نہیں ہوتا تو تکمیل عمل کے لئے مدد دی جاتی ہے۔ مثلاً عرق بادیان پلایا جاتا ہے۔ تو مسہل کو اور مدد کو دونوں کو تنقیہ مادہ میں من وجہ دخل ہے۔ لیکن ان دونوں میں اصل مسہل ہے اور مدد معین کے درجہ میں ہے۔ تو اگر کوئی مسہل تو پئے لیکن اس کی مدد کے لئے عرق بادیان وغیرہ نہ پئے، تو اس کا کام تو جیسے تیسے چل ہی جائے گا، اور مادہ کا تنقیہ ہو جائے گا، گو دیر میں ہو، لیکن اگر کوئی صرف مدد کی چیز یعنی عرق بادیان وغیرہ تو پی لے اور املتاس، یا سنا وغیرہ جو اصل مسہل ہے وہ نہ پئے

تو پھر کچھ بھی کام نہ چلے گا۔

اسی طرح اصلاح کے لئے اصل چیز ہمت اور قصد ہے، اور ہمت پیدا ہونے کے لئے ذریعہ سہولت کا صحبت ہے۔ اور اس کے ساتھ تھوڑا ذکر بھی بطور مدد ہو تو مفید ہے لیکن محض ذکر کافی نہیں۔ اس وقت ذکر کے متعلق عام غلطی شائع ہو رہی ہے، اور بعض مشائخ بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں۔

رسالہ المبلّغ ۱۲ جلد ۱۲ بابت ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ

(درجسٹرڈ حرف اے ۹)

اس میں افراط وتفریط ہو رہی ہے۔ بعض تو ذکر کو بالکل بے سود سمجھتے ہیں، اور طالبین کو صرف مجاہدوں میں ڈال دیتے ہیں، اور ایسی ایسی محنتیں لیتے ہیں کہ صحت خراب ہو جاتی ہے، اور دماغ بے کار ہو جاتا ہے، حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ پھر طالب پریشان ہو کر سب کام چھوڑ کر بیٹھ رہتا ہے۔ اور بعض لوگ ذکر ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور وظیفہ ہی وظیفہ بتلائے جاتے ہیں، مدتیں گزر جاتی ہیں اور ان کو کچھ بھی نفع نہیں ہوتا۔ بات وہی ہے کہ اصل چیز قصد وہمت ہے۔ اور اس کا موثر ذریعہ صحبت ہے، اور ذکر معین ہے۔ اور لوگوں نے وظیفوں کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ جو آتا ہے وظیفے ہی پوچھتا آتا ہے۔ نہ نماز کی تصحیح کی ضرورت سمجھتے ہیں، نہ زکوٰۃ کے مسائل معلوم کرنے کی، نہ اصلاح معاملات کی اور معاشرات کو تو آجکل دین سے خارج ہی مان لیا گیا ہے۔ غرض شریعت کے علم وعمل کسی کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ بس بڑی دوڑ یہ ہے کہ وظیفے پڑھا کرو۔

ایک مہمان میرے یہاں تشریف لائے، ہاتھ میں ہر وقت تسبیح چلتی رہتی تھی۔ آپ نے جماعت کی نماز پڑھی قعدہ اولیٰ کے بعد امام کھڑا ہوا تو وہ نہ اٹھے، سب کو تعجب ہوا، بعد سلام کے پوچھا یہ آپ نے کیا کیا؟ کہنے لگے میں مسافر ہوں! قصر نماز پڑھی ہے بہت افسوس ہوا ان کی جہالت پر میں نے کہا ارے ظالم اس تسبیح کو تو طاق میں رکھ، اور میرا بہشتی زیور ہاتھ میں لے، اور اپنے ارکان اسلام کو درست کر، اس کے بعد تسبیح اٹھانا۔ یہ حالت ہو رہی ہے۔ اگر مشائخ کی تعریف کی جاتی ہے تو یہی کہ فلاں صاحب کسی سے بات تک بھی نہیں کرتے ہر وقت تسبیح ہی پڑھتے رہتے ہیں۔ اور جہاں

یہ نہیں ہے بلکہ مہمانوں سے بات چیت کرنا ہے، طالبعلموں کو پڑھانا ہے، گھر والوں سے ملنا جلنا ہے، اور ان کے دین کی نگرانی کرنا ہے، تو ان کو کہا جاتا ہے کہ یہ تو دنیا دار ہیں اللہ والے نہیں ہیں۔ اللہ والے کو غیر اللہ سے کیا علاقہ۔

صاحبو! سب سے بڑے اللہ والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضورؐ کی سوانح اٹھا کر دیکھو حضورؐ کے مشاغل کیا تھے؟ حضورؐ کی کتنی بیویاں تھیں، کتنے مکان تھے کتنے خادم تھے، کتنے سواری کے جانور تھے۔ کیا حضورؐ بس تسبیح لئے مسجد ہی میں بیٹھے رہتے تھے، یا لوگوں سے ملتے جلتے بات چیت بھی کرتے تھے، حضورؐ تو مسلمانوں سے کیا کفار سے بھی بات چیت کرتے تھے۔ گھر میں بھی رہتے تھے، وعظ و تلقین بھی فرماتے تھے۔ لوگوں کے مکانوں پر بھی جاتے تھے، مریضوں کی عیادت کرتے، جنازوں کی نماز پڑھتے۔ دفن میں شرکت فرماتے تھے۔ کیا یہ سب کام دنیا داری کے ہیں۔ خیر یہ تو جہالت کی باتیں ہیں کہ ہر وقت تسبیح گھماتے رہنا ہی کمال ہے، اور بلا اس کے کمال ہوتا ہی نہیں۔ صاحبو! کمال ہوتا ہے اتباع شریعت سے ہر حالت میں، بولنے میں، چلنے میں کھانے میں، پینے میں، لینے میں، دینے میں، ملنے میں، جلنے میں۔ اور یہ سب باتیں جبھی حاصل ہو سکتی ہیں جب شریعت کا علم ہو تو علم مقدم ہوا تسبیح گھمانے، اور وظیفے گھونٹنے پر اسی بنا پر میں نے ان مہمان صاحب سے کہا کہ یہ جو تسبیح ہر وقت تمہارے ہاتھ میں رہتی ہے اس کی ضرورت نہیں، نماز درست کرو اس کے مسئلے پڑھو یا پوچھو۔

غرض آج کل بعض لوگ اس مذاق کے ہیں کہ ذکر اور وظیفوں ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور بعضے اس مذاق کے ہیں کہ ذکر اور وظیفوں کو بیکار سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ اصل چیز علم اور ہمت ہے، اور ذکر اس کا معین ہے۔ اس نفع کے لئے ذکر ضرور کرنا چاہیئے۔ ذکر سے قلب میں نورانیت پیدا ہوتی ہے حدیث میں ہے "اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ"۔ یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس

شخص کا ہمنشین ہوں جو میرا ذکر کرتا ہے۔ اس سے زیادہ کیا فضیلت ہو سکتی ہے کہ ذکر سے حق تعالیٰ کے ساتھ ہمنشینی حاصل ہوتی ہے۔ اب شاید کوئی کہہ دے کہ جب ذکر سے صحبت مع اللہ حاصل ہوتی ہے، تو اور کس چیز کی ضرورت رہی؟ پھر بات لوٹ آئی کہ اصل چیز ذکر ہے۔ اور اللہ کی مصاحبت حاصل ہونے کے بعد اور کسی کی صحبت کی ضرورت کیا رہی؟

بات یہ ہے کہ ایک چیز بے قاعدہ ہوتی ہے اور ایک باقاعدہ۔ صرف ذکر سے صحبت مع اللہ ضرور حاصل ہوگی مگر بے قاعدہ۔ اور کسی محقق کی صحبت میں رہنے سے بھی مصاحبت مع اللہ حاصل ہوگی اور باقاعدہ۔ اور یہ وہ ذکر ہوگا۔ جس سے مصاحبت مع اللہ صحیح معنوں میں حاصل ہوگی۔ اسکی مثال سمجھو کہ! ایک بادشاہ ہے، اس سے قرب کا ہر شخص متمنی ہے۔ اور اس کا قرب بہت سے منافع کو مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن قرب دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک بے قاعدہ اور ایک باقاعدہ تو وہ ہے جو ان لوگوں کو حاصل ہے۔ جن سے بادشاہ راضی ہے، یہ تو مفید ہے، یہ قرب وہ ہے جس کے لئے قرب صوری کی بھی ضرورت نہیں، یہ اس شخص کو بھی حاصل ہے جو بادشاہ سے منزلوں دور رہتا ہے۔ مثلاً ایک عامل ہے، جو بادشاہ کی طرف سے کسی علاقہ پر مامور ہے، اور خیر خواہ اور کارگزار ہے، اور بادشاہ اس سے راضی ہے۔ اس کو گو قرب صوری حاصل نہیں، مگر قرب معنوی حاصل ہے، دور بیٹھے ہی بادشاہ اس کو انعامات، تمغے، اور خطابات عطا کرتا ہے۔ اگر اس شخص کو قرب معنوی کے ساتھ قرب صوری بھی حاصل ہو جائے تو کیا کہنے ہیں۔ مثلاً بادشاہ ان کو دربار میں حاضری کی اجازت دے، کسی تقریب میں بلائے تو کیا لطف ہوگا۔ سلامی دی جائے گی، اور فوج سے استقبال کرایا جائے گا۔ اور کیا کیا ہوگا، یہ قرب تو باقاعدہ ہوا، اور دور بیٹھے بھی حاصل ہے، اور اس کے ساتھ قرب صوری بھی حاصل ہو جائے تو سونے پر سہاگہ کہنا چاہیئے۔

اور ایک قرب بے قاعدہ ہے۔ وہ وہ ہے، جس میں رضا بادشاہ کی حاصل نہیں اور اس میں پھر دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ رضا تو حاصل نہیں مگر "سخط" یعنی غصہ بھی نہیں۔ اور ایک یہ کہ رضا نہ ہونے کے ساتھ غصہ اور عتاب بھی ہے۔ اوّل کی مثال دو تماشائی ہیں جو مثلاً بادشاہ کی سواری نکلنے کے وقت راستوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ وہ بھی بادشاہ سے قریب ہیں۔ مگر نہ ان پر بادشاہ کی کوئی عنایت ہے نہ ناراضی ہے قرب ان کو بھی حاصل ہے مگر ایسا قرب ہے کہ نہ مفید ہے نہ مضر اور دوسرے قرب کی مثال وہ قرب ہے جو ایک مجرم کو حاصل ہے، جو مشکیں بندھا ہوا بادشاہ کے سامنے کھڑا ہے۔ کہ وہ بہت ہی قریب ہے، اور عجب نہیں کہ سب سے زیادہ قرب اسی کو حاصل ہو۔ مگر یہ قرب کس کام کا جس کے ساتھ موت کو بھی قرب ہے۔ خدا بچاوے ایسے قرب سے۔ یہ تینوں قسم کے قرب قرب ہی کے تو افراد ہیں۔ مگر مطلوب قرب وہی ہے جو اس عامل کو حاصل ہے۔ اور درمیانی قرب بھی غنیمت ہے۔ مگر اخیر کا قرب تو پناہ مانگنے کی چیز ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرب جو رضا کے ساتھ ہو وہی حقیقی قرب ہے، اور وہی مفید ہے۔ اور جو قرب ناراضی کے ساتھ ہو وہ حقیقت میں قرب ہی نہیں ہے بلکہ بُعد ہے اور ڈرنے کی چیز ہے۔

اب سمجھ لیجئے کہ رضا الٰہی کا ہے سے حاصل ہوتی ہے۔ صرف اعمال سے جب اعمال برے ہیں تو رضا حاصل نہیں۔ پھر اگر قرب ہوا بھی تو وہ قرب باقاعدہ نہ ہوگا بلکہ بے قاعدہ ہوگا۔ پس میں مانتا ہوں کہ ذکر سے مصاحبت مع اللہ حاصل ہوتی ہے لیکن جب اعمال درست نہیں تو یہ مصاحبت چنداں مفید نہیں۔ کیونکہ اعمال درست ہونے کی وجہ سے رضا حاصل نہیں۔ اور بلا رضا کے قرب کا حاصل میں بتا چکا ہوں کہ وہ ہے جو مجرم کو بھی حاصل ہے۔ ہاں اعمال درست ہوں اور اس کے ساتھ ذکر بھی ہو تو قلب میں نورانیت پیدا ہوتی ہے، اور اس سے جو قرب ہوتا ہے وہ قرب حقیقی ہے۔ اسی کو میں نے قرب

باقاعدہ کہا ہے۔ اور اعمال کی درستی میں بڑا دخل ہے نیک صحبت کو۔ اسی واسطے کہا ہے۔

؎ ہر کہ خواہد ہمنشینی با خدا گو نشیند در حضورِ اولیا

اور کہا ہے ؎ صحبت نیکاں اگر یکساعت است بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

اور کہا ہے ؎ صحبت صالح ترا صالح کند صحبت طالح ترا طالح کند

اس شعر میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی۔ نیک صحبت کے اثر کا بیان بھی ہے، اور بد صحبت کے اثر کا بھی۔ اس کا بہت اہتمام رکھنا چاہیئے کہ صحبت اچھی ہے یا بری کیونکہ آج کل اچھوں کی صورت میں راہزن بہت ہیں جو خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اور یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر کہیں بری صحبت میں غلطی سے جا پھنسے تو اس کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ مگر چھوڑنا چاہیئے لطافت کے ساتھ، دل شکنی نہیں کرنی چاہیئے۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے کفار کو چھوڑنے کا مگر کس طرح وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (القرآن) یعنی ان کو چھوڑ دیجئے خوبی کے ساتھ یہ معاملہ کفار کے ساتھ ہے، اس سے سبق لینا چاہیئے کہ مسلمان کو اگر چھوڑنا ہو تو کس طرح چھوڑنا چاہیئے۔ بس نہایت نرم الفاظ میں عذر کر دے کہ میں اب آپ سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا، اور اس کے ساتھ کسی قسم کی بے ادبی نہ کرے، اور ایذا نہ دے۔ یہ حق ہے صحبت کا۔

اور صحبت نیک کی تاثیر اور ضرورت کے متعلق ایک نکتہ سمجھنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ ہمیشہ سے قانونِ قدرت اور عادت الٰہی یہی رہی ہے، کہ انبیا علیہم السلام کو بھیجا، صحیفے اور کتابیں نازل فرمائیں، جن سے گمراہوں کو ہدایت ہوئی اور حق و باطل میں امتیاز ہو گیا۔ حالانکہ ایک صورت یہ بھی تو ہو سکتی تھی کہ صرف صحیفے، اور کتابیں اتار دی جاتیں، ان میں احکام ہوتے ان پر لوگ عمل کرتے، اور ارشادات خداوندی کا امتثال ہو جاتا۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا

بلکہ صحیفے اور کتابیں اتارنے کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کو بھی مبعوث فرمایا۔ اس میں کون سی بات بڑھ گئی، وہی ایک چیز بڑھ گئی جس کا نام صحبت ہے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ صحبت موقوف علیہ ہے اصلاح کے لئے۔ اسی معنیٰ کو مولانا کہتے ہیں۔

ے بے عنایات حق و خاصان حق اندریں رہ کے توان بردن سبق

عنایت بمعنے توجہ و تعلیم ہے جو حاصل ہے صحبت کا۔

اس توجہ کے لفظ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ توجہ کے متعلق کچھ ضروری بیان کیا جاوے، اور یہ لفظ "توجہ" اہل طریق میں بہت مستعمل ہے، اور اس کو آج کل بڑا کمال سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں! فلاں ایسے بزرگ ہیں کہ ایک نظر جس پر ڈال دی وہ مسخر ہوگیا، بلکہ ولی کامل ہوگیا۔ اور اکثر طالبین اسی توجہ کی درخواست کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے مجھ سے نماز نہیں پڑھی جاتی، ایسی توجہ ڈالیئے کہ میں پکا نمازی ہو جاؤں۔ کوئی کہتا ہے مجھ سے بدنظری کا مرض نہیں چھوٹتا، ایسی توجہ کیجئے کہ پھر میری نظر بے موقع اٹھ ہی نہ سکے۔ اور معلوم نہیں کیا کیا اسی قسم کی درخواستیں ہوتی ہیں۔ حاصل ان سب کا یہ ہے کہ خود کچھ کرنا نہ پڑے سب کرنا کرانا پیر صاحب ہی کے ذمہ ہے۔ صاحبو! کوئی یہ درخواست نہیں کرتا کہ ایسی توجہ کیجئے کہ بلا کھائے پیٹ بھر جایا کرے یا بلا نکاح اولاد ہو جایا کرے۔ جب پیر صاحب کی توجہ سے سب کچھ ہو سکتا ہے، تو بلا کھائے پیٹ بھی بھر سکتا ہے، اور بلا نکاح اولاد بھی ہو سکتی ہے۔ پھر یہ درخواست کیوں نہیں کی جاتی؟ بات یہ ہے کہ پیٹ بھرنے کی اور اولاد کے ہونے کی ضرورت اور وقعت تو قلب میں ہے، لہٰذا ان کے لئے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے، اور کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا۔ اور اصلاح قلب اور نماز، روزہ وغیرہ، اور اجتناب عن المعاصی کی ضرورت اور وقعت ہی قلب میں نہیں ہے۔ لہٰذا یہ حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں۔ اور اگر کسی نے ذرا سا سہارا دے دیا کہ ہاں دعا کریں گے، یا توجہ کریں گے

تو بس خوئے بدرا بہانہ بسیار اس امید دلانے پر اطمینان ہو گیا، اور فراغت ہو گئی کہ بس سب کچھ آپ سے آپ ہو رہے گا۔

صاحبو! اگر توجہ متعارف سے اصلاح ہو جایا کرتی تو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کون اس کام کو کر سکتا تھا، اور ان سے زیادہ کون شفیق ہو سکتا تھا۔ مگر ان حضرات نے کبھی اس سے کام نہیں لیا، مصیبتیں اٹھائیں، جہاد کئے، بُرے بُرے الفاظ سنے مگر یہ نہیں کیا کہ توجہ ڈال کر سب کے قلوب مسخر کر لیتے اور بس سب کا تزکیہ ہو جاتا۔ حالانکہ اس سے یہ فائدہ ہوتا کہ ان حضرات کو بھی سہولت ہوتی، مصیبتیں نہ اٹھانی پڑتیں۔ اور طالبین کو تو بہت ہی آسانی ہوتی کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑتا۔ آپ غور کر سکتے ہیں کہ کوئی بات تو ہے جو ایسا نہیں کیا۔ اور وہ حضرات کیا کرتے حق تعالیٰ ہی نے ان کے واسطے اس کو تجویز نہیں کیا، کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کرتے تھے، بس وہی کرتے تھے جو وحی کے ذریعہ سے ان کو امر کیا جاتا تھا۔ اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ توجہ بالمعنی المتعارف غیر سنت ہے اس لئے میں نے شعر مذکور (یعنی بے عنایات حق وخاصان حق الخ) میں عنایت کی جو تفسیر "توجہ وتعلیم" کی ساتھ کی ہے اس توجہ کو معنیٰ متعارف پر محمول نہ کیجئے گا، بلکہ التفات اور دلسوزی کے معنیٰ لیجئے۔ اور یہ "التفات اور دلسوزی" عادۃً جبھی ہوتی ہے جب کہ ان کے پاس رہا جائے۔ اسی لئے میں نے اس کا حاصل صحبت کو بتلایا۔

یہاں کوئی توجہ کے متعلق یہ شبہ نہ کرے کہ توجہ بالمعنی المتعارف کا مل تو بہت سے بزرگوں سے منقول ہے، اور میں نے اس کو غیر سنت کہہ دیا۔ بات یہ ہے کہ توجہ بالمعنی المتعارف بزرگوں سے بیشک منقول ہے، اور معمول رہا ہے، مگر سنت تو نہیں۔ تو غیر سنت کا اتنا درجہ بڑھانا یعنی اسی کو کافی سمجھ لینا، اور اسی کو معیار کمال سمجھ لینا، اور جس کو یہ حاصل نہ ہو اس کو ناقص سمجھ لینا، یہ عظیم غلطی ہے۔ نہ وہ کافی ہے، ورنہ انبیاء علیہم السلام اسی سے کام لیتے۔ نہ وہ کمال ہے کیونکہ بے دینوں کو بھی حاصل ہے، بہت سے جوگی بھی اس کا ملکہ

رکھتے ہیں پس وہ چیز مسلمان کے لئے کیا کمال ہو سکتی ہے جس کے لئے اسلام کا ہونا بھی شرط نہیں۔ اور بزرگوں نے جو اس سے کام لیا ہے تو بطور تقویت کے لیا ہے، اصل چیز تعلیم ہے۔ بعض دفعہ کسی کو کچھ تعلیم کیا جاتا ہے اور وہ محنت کرتا ہے، مگر ضعف استعداد سے اس کو خاص نفع (جو کسی مصلحت سے مطلوب ہے) نہیں ہوتا، تو اس وقت اس توجہ سے اس پر خاص اثر ڈالا جاتا ہے، جس سے کامیابی ہونے لگتی ہے۔ مگر وہ نفع خاص خود ہی مطلوب نہیں وہ بھی درجہ معین میں ہے۔

اس توجہ کی مثال روٹی کا چولہے میں سینکنا ہے۔ کہ روٹی کی تکمیل، تیاری میں اس کو بھی دخل ہے۔ لیکن یہ دخل فی الجملہ ہے، نہ یہ کہ صرف سینکنا روٹی کی تیاری کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ یہ کافی نہیں کہ کوئی کچے آٹے کو صرف سینک کر روٹی تیار کر لے۔ بلکہ آٹے کو گوندھنا پڑے گا، اور روٹی بڑھا کر گرم توے پر اس کو پکانا ہوگا، پھر چولہے میں سینکنا ہوگا، اس سے روٹی تیار ہوگی۔ اور اگر وہ توے ہی پر سینکی گئی تو پھر چولہے میں سینکنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اسی طرح اصلاح تو ہوتی ہے علم و عمل سے، مگر کبھی اس اصلاح میں قوت پیدا کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے "توجہ متعارف" کی، اور اس وقت اس سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ ہر چیز کو اپنے مرتبہ پر رکھنا چاہیئے۔ یہ حل ہے! اس شبہ کا کہ بزرگوں سے توجہ متعارف منقول ہے۔

اب میں سابق کی طرف عود کرتا ہوں! میں صحبت کی برکات کا بیان کر رہا تھا۔ دلائل سے ثابت ہو گیا کہ صحبت اہل اللہ کی عجب چیز ہے۔ اس سے ہمت پیدا ہوتی ہے جو اصلاح میں خاص موثر ہے۔ یہاں ایک تفصیل تھی آیت کے ایک جزو اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ ۔ کی اب آیت کا دوسرا جزو رہ گیا یعنی اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ" جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "یا اس شخص کو نفع ہوگا قرآن سے جس نے قرآن کو سنا توجہ کے ساتھ کان لگا کر۔ اس تقابل پر نظر ظاہر میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ کان لگا کر سننا یہ بھی ایک ذریعہ

علم ہی کا ہے، تو معنیٰ یہ ہوئے کہ جس کو علم ہو، اس کو نفع ہوگا قرآن سے اور لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ میں بھی یہی مضمون تھا جیسا آپ نے اس کا حاصل سنا کہ "جس قلب میں علم و عزم ہو الخ" تو اس دوسرے جملہ میں باعتبار علم کے بلکہ ظاہراً تکرار ہوگیا۔

اس شبہ کا حل یہ ہے کہ معلومات دو قسم کی ہوتی ہیں! ایک وہ جو بدون سنے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ اور ایک وہ جو بدون سنے سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اوّل کی مثال! مسئلہ وجود صانع ہے، کہ یہ سننے پر موقوف نہیں۔ دنیا میں کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی ایسا نہیں جو فعل کے لئے فاعل کی ضرورت نہ سمجھتا ہو۔ اور دوسری کی مثال! مسئلہ معاد ہے، اور کیفیتِ حشر و نشر، و جنت و نار ہے۔ کہ اس کا علم بلا سماع کے نہیں ہو سکتا تو لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ متعلق ہے قسم اوّل کے۔ معنیٰ یہ ہوئے کہ جس کا قلب سلیم ہو۔ یعنی اس میں عقل سلیم سے استعداد ہو صحیح بات کے سمجھنے کی۔ چنانچہ "صاحبِ جلالین" نے "قلبٌ" کی تفسیر عقل سے کی ہے۔ اور "اَلْقَى السَّمْعَ" متعلق ہے قسم دوم کے معنیٰ یہ ہوئے کہ جو باتیں مدرک بالعقل نہیں جن کو سَمْعِیَّات کہتے ہیں، ان کے متعلق یہ عادت ہو اس شخص کی کہ غور سے سنے خواہ مخواہ عناد نہ کرے۔ جیسے کفار نے کہہ دیا تھا کہ "قُلُوْبُنَا فِيْ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَا اِلَيْهِ وَفِيْ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ" یعنی جس بات کی طرف آپ ہم کو بلاتے ہیں، اس کی طرف سے ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں، اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے، اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔" مطلب یہ کہ تمہاری دعوت کو قبول کرنا تو کہاں، ہم تمہاری بات سننا بھی نہیں چاہتے۔ یہ عناد ہے تو جس شخص میں یہ عناد نہ ہوگا، بلکہ غور سے سنے گا قرآن کو، تو اس کو بھی نفع ہوگا۔ اور قرآن جو باتیں سَمْعِیَّات کی قسم سے بتائے گا وہ اس کی سمجھ میں آجائیں گی۔ کیونکہ وہ باتیں سب حق ہیں۔ عناد سے ان پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جب عناد نہ ہوگا تو ان کی واقعیت قلب میں بیٹھتی چلی جائے گی۔ تو حاصل یہ ہوا! کہ جس میں ایسا قلب ہو کہ عقلیات میں صفت سلامت

رکھتا ہو، اور بات کو صحیح سمجھتا ہو، (اور یہ حاصل ہے جزو اوّل کا) اور سمعیات میں قرآن کو کان لگا کر توجہ سے سنے، عناد نہ کرے، تو اس کو نفع ہوگا قرآن سے۔ اب جملہ "اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ" میں تکرار نہ رہا، تقابل ہو گیا۔

اب ایک شبہ اور رہا کہ اوپر جو قلب کی صفت بیان کی گئی اس میں کسی علم کی تخصیص نہیں تھی اور تقابل کا مدار تخصیص ہے۔ تو تعمیم میں پھر تقابل نہ رہا۔ جواب یہ ہے کہ یہ تقابل منطقی نہیں کہ ایک دوسرے کا جزو نہ ہو "تقابلِ عرفی ہے" جس کے لئے بعض اجزاء کا تقابل بھی کافی ہے۔ پھر یہ تقابل تضاد کا نہیں ہے بلکہ مانعۃ الخلو ہے کیونکہ دونوں صفتیں ایک شخص میں جمع ہو سکتی ہیں، اور صحتِ حکم کے لئے ہر واحد کافی ہے (کما یاتی) جو شان ہوتی ہے مانعۃ الخلو کی چنانچہ شروع وعظ کے ذرا بعد دل گردہ کی مثال سے ذرا پہلے مانعۃ الخلو ہونے کی تصریح ہے۔ ثم رأیت بعد سنین فی روح المعانی ما یقارب هذا باختلاف العنوان مع الحکم بکونه مانعة الخلو ولله الحمد ولهذا التقابل وجوه اخری محتملة

اب ان متقابلین میں جو امر مشترک ہے، اور وہ امر "مشترک" روح ہے شرائط کی، وہ قلب سلیم ہے۔ کیونکہ عناد نہ ہونا بھی صفت قلب ہی کی ہے۔ تو مدار آخر قلب ہی پر ٹھہرا تو یہ معنی ہوئے کہ جس شخص میں ایسا قلب ہو جس کو قلب کہا جا سکتا ہے کہ عقلیات کے متعلق بھی سلیم ہو اور سمعیات کے متعلق بھی سلیم ہو اس کو نفع ہوگا قرآن سے۔ اور چونکہ یہ سب آثار قلبِ سلیم کے لوازم سے ہیں تو بواسطہ ملزوم کے ان سب لوازم میں بھی تلازم ہوگا۔ تحققِ ملزوم کے وقت تو تلازم عقلی اور صرف ایک لازم کے تحقق کے وقت تلازم عرفی۔ اس لئے ہر واحد کے تحقق کو صحتِ حکم کے لئے کافی کہیں گے (یہ بیان ہے سیاق کا جو ابھی گزرا) خلاصہ یہ کہ قرآن نصیحت ہے قلب سلیم کے لئے۔ تو قلب کو سلیم بنایئے پھر دیکھئے قرآن سے کیا کیا چیزیں حاصل ہوں گی۔ جب قلب سلیم ہوگا تو قرآن سے اس میں صفت علم بڑھے گی۔ اور اس میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی۔ اسی کے بارہ میں کہا ہے۔

؎ بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

یعنی وہ علوم پیدا ہوں گے کہ تمام علوم ان کے سامنے گردنظر آئیں گے، اور ہر چیز کی حقیقت منکشف ہوگی وہ علوم ہوں گے جن کو علوم کہنا صحیح ہے سفسطی اور اوہام نہ ہوں گے۔ دنیا کے عقلاء ان کے سامنے سر جھکائیں گے۔ اور اس علم کی برکت سے ہمت کی تزاید کی بھی یہ کیفیت ہوگی، کہ کسی کا خوف اس کے دل میں نہ رہے گا۔ دنیا بھر ایک طرف اور وہ ایک طرف۔

؎ موحد چہ در پائے ریزی زرش چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد زکس ہمیں است بنیاد توحید و بس

نہ کسی خوف سے حق سے منحرف ہوگا، نہ کسی لالچ سے وہ حق کو چھوڑے گا۔

اور ہمت کی قوت کی وہ حالت ہوگی جو "بہلول دانا" ایک بزرگ سے نقل کرتے ہیں، کہ انہوں نے اون بزرگ کو دیکھا کہ بہت خوش خوش بیٹھے ہیں، پوچھا! کہئے کیا حال ہے۔ کہا اس شخص سے زیادہ خوش کون ہو سکتا ہے کہ سارے جہاں میں کوئی کام اس کے ارادہ کے خلاف نہ ہوتا ہو۔ پوچھا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہا یہ تو مسلم ہے کہ ہر کام حق تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتا ہے، سو جس شخص نے اپنے ارادہ کو حق تعالیٰ کے ارادہ میں فنا کر دیا ہو تو ہر کام اس کے ارادہ کے موافق ہی ہوگا، تو یہ کہنا صحیح ہوا کہ کوئی کام اس شخص کے ارادہ کے خلاف نہیں ہوتا۔ پھر ایسے شخص کے پاس غم کا کیا کام؟ اس کی حالت تو حق تعالیٰ کے ساتھ یہ ہوتی ہے۔

؎ زندہ کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو

دل شدۂ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اور اس کی حالت یہ ہوتی ہے۔

؎ ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من

پھر اس کے پاس غم اور پریشانی کا کیا کام؟ اور پریشانی تو ہمیشہ مقصود کے فوت ہونے سے ہوتی ہے۔ اور جس کا مقصود ہی وہ ہے جو حق تعالیٰ کا مقصود ہے، تو اس کے مقصود کے فوت ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں۔

مثلاً ایک شخص نوکری چاہتا ہے، تعلیم حاصل کی، روپیہ خرچ کیا، سفارشیں بہم پہنچائیں، مگر نوکری نہیں ملی تو اس کو رنج ہوگا۔ یہ رنج کیوں ہے؟ اس واسطے کہ مقصود فوت ہوگیا، اگر مقصود فوت نہ ہوتا، اور نوکری مل جاتی تو رنج نہ ہوتا بلکہ خوشی ہوتی۔ اسی طرح کسی نے کیمیا بنانا چاہی، استادوں کے نخرے اٹھائے گھر بار چھوڑا، امیر سے فقیر ہوگئے تب ایک نسخہ ملا، اور بہزار وقت اس کو مہیا کیا، اور چڑھایا، جب آنچ ختم ہوئی اور اس کو اتارا تو وہاں کچھ بھی نہیں، ایک تانبے کی کسر ہی رہی۔ ایسی صورت میں اس شخص کو کیا کیا رنج ہوگا۔ یہ رنج کیوں ہے؟ اس واسطے کہ مقصود حاصل نہ ہوا۔ غرض رنج بھی ہوتا ہے جب مقصود حاصل نہ ہو۔ اور جس کا مقصود ہر وقت حاصل ہی ہو، اس کے پاس رنج کا کیا کام؟ جس کا مقصود وہی ہے جو اللہ کا مقصود ہے۔ وہاں فوت مقصود کا احتمال ہی نہیں۔ بلکہ اس سے آگے جس کو خود اللہ ہی مقصود ہو تو اللہ کو تو نہ فنا ہے نہ تغیر ہے اس کو پریشانی اور رنج سے کیا واسطہ؟ تندرست ہے تب اس کا مقصود حاصل ہے، بیمار ہے تب اس کا مقصود حاصل ہے، غنی ہے تب اس کا مقصود حاصل ہے، فقیر ہے تب اس کا مقصود حاصل ہے۔ غرض اس کا مقصود ہاتھ سے جا ہی نہیں سکتا، پھر رنج و غم کیسا۔

سو ایسے قلب میں جو حالت ہمت کی ہوگی ظاہر ہے، یہ ہے قلب جس کو قلب کہنا چاہیئے یہ قلب محل ہوتا ہے تجلیات لامتناہیہ کا اور مہبط ہوتا ہے انوار الٰہیہ کا۔ اسی کی نسبت کہا ہے۔

؎ آئینہ سکندر جام جم است بنگر تا بر تو عرضہ دارد احوال ملک دارا

یہ قلب اس آئینہ کی طرح ہو جاتا ہے جو بہت صاف ہے، اور تمہارے سامنے رکھا ہوا ہے، اس میں وہ چیزیں صاف نظر آتی ہیں۔ جو تمہاری نظر کے سامنے نہیں ہیں بلکہ پس پشت ہیں۔

اس شعر میں سکندر اور دارا سے مراد وہ دو بادشاہ نہیں ہیں جن میں کسی وقت میں لڑائی ہوئی تھی۔ (جس کا ذکر سکندر نامہ میں ہے) بلکہ دو مخالف مراد ہیں، جنکو تشبیہاً سکندر اور دارا کہہ دیا ہے، اس وجہ سے کہ ان دونوں میں سخت مخالفت ہوئی تھی۔ سکندر تم ہو، اور دارا وہ ہے جو سب کو دار پر لے جا رہا ہے، اور یہ وہ ذات شریف ہیں۔ جن کو سب جانتے ہیں۔ ان کا نام ہے ابلیس۔ آپ میں اور ابلیس میں بھی غایت درجہ کی مخالفت ہے۔ جیسے سکندر اور دارا میں تھی۔ تو شعر مذکور کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے اندر ایک آئینہ سکندریا جام جم موجود ہے، اس میں دیکھو اور غور کرو اس میں ملک دارا یعنی ابلیس کے حالات نظر آئیں گے۔ یعنی ابلیس کے تلبیسات اور مکر و فریب کا انکشاف ہو جائے گا تو ان سے بچ سکو گے۔ یہ اسی قلب کی نسبت کہا ہے جس میں صفاتِ قلب موجود ہوں، اور جو قلب کہے جانے کے قابل ہو۔ جیسا کہ آپ نے طویل تقریر میں سنا۔ واقعی اگر قلب میں صفتِ سلامت پیدا ہو جائے تو ایسا دقیقہ رس ہو جاتا ہے کہ بے تکلف خیر و شر کا ادراک کر لیتا ہے۔ جیسا حسِ ذائقہ جو زبان میں ہے، کہ منہ میں چیز رکھتے ہی فوراً بتاتا ہے کہ یہ نمکین ہے یا میٹھی، نہ سوچنے کی ضرورت ہے، نہ مقدمات کی ترتیب اور استدلال کی، دنیا ایک طرف ہے اور حسِ ذائقہ ایک طرف، تو بات وہی صحیح ہوگی جو حسِ ذائقہ نے بتائی ہے۔ اسی طرح اہل دل کا دل حق و باطل کو اوّل ہی وہلے میں پہچان لیتا ہے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل، اور اتنا حق ہے اور اتنا اس میں باطل ملا ہوا ہے، ابھی استدلال کی

بھی نوبت نہیں آئی کہ ان کے دل نے حکم لگا دیا۔ بعض اوقات اہل استدلال ان سے معارضہ کرتے ہیں، اور ممکن ہے کہ اس وقت اس کا جواب بھی نہ دے سکیں۔ مگر غور کرنے کے بعد خود معارض ہی کو دلیل بھی مل جائے گی۔ اور ان اہل استدلال کو ساکت ہونا پڑے گا، اور ثابت ہو جائے گا کہ ان کے دل کا حکم لگا دینا صحیح تھا۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ خلوت میں تھے اتفاقاً کفار اور مسلمانوں میں مقابلہ ہوا، ان کو جوش اٹھا کہ چلو جہاد کے لئے۔ اس موقع پر کوئی غیر محقق ہوتا تو فوراً کھڑا ہو جاتا اور سمجھتا کہ بڑا کام کیا، اور بڑی ہمت کی، کیونکہ جہاد جانبازی کا کام ہے اس سے زیادہ ہمت کا کام کون سا ہو گا مگر محقق کا کام یہ ہے کہ ہر کام کو سوچ کر کرے، اور غور کرے کہ یہ کام حق تعالیٰ کے حکم کے موافق ہے یا نہیں۔ چنانچہ جہاد جیسے کام میں بھی انہوں نے جلدی نہیں کی کہ ایسا نہ ہو اس میں کوئی مخفی غائلہ ہو۔ بہت سوچا لیکن اطمینان نہ ہوا، بس حق تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ مجھے اس کے بارہ میں شرح صدر عطا فرما دیجئے۔ فوراً سمجھ میں آیا کہ یہ خیال نفس کا ہے۔ رہا یہ کہ نفس نے ایسے عمل کی ہمت کیسے کی جس میں سراسر تکلیف ہے، حتیٰ کہ جان کا اندیشہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نفس کو ہر وقت ذکر شغل میں مراقبہ میں قسم قسم کی ریاضت میں رکھتے تھے۔ یہ ہر وقت کی مصیبت تھی۔ نفس نے کہا کہ جہاد میں جائیں گے ایک دفعہ قتل ہو جائیں گے۔ تھوڑی دیر کی تکلیف ہو کر ختم ہو جائے گی ہر وقت کی مصیبت سے یہ ہے، اس واسطے جہاد کی تلقین کی۔ جب یہ سمجھ گئے۔ تو نفس سے کہا کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے اور یہ فرض عین ہے۔ ظاہر ہے کہ فرض عین زیادہ موکد ہے فرض کفایہ سے، لہٰذا میں اسی کو اختیار کرتا ہوں۔ اور تجھے اسی میں رکھوں گا اور اور زیادہ رگڑوں گا گا۔ یہ فریب اور مکر ہیں شیطان کے۔ ان کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ ان کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے قلب میں پوری پوری صفتِ سلامت ہو، اور حق کے پہچاننے کا ایسا احساس پیدا ہو گیا ہو جیسے زبان میں قوت ذائقہ ہے کہ منہ میں رکھتے ہی حکم لگا دیتی ہے کہ یہ چیز

کڑوی ہے، اور یہ میٹھی، اگرچہ دلائل اور شواہد اس کے خلاف ہوں۔ مثلاً ایک شخص نے ہمارے سامنے قند پانی میں گھول کر شربت بنایا، ظاہر ہے کہ یہ شربت میٹھا ہی ہوگا، لیکن جب زبان تک پہنچا تو تلخ پائی گئی۔ اب اس وقت دلائل و شواہد کا حکم تو یہ ہے کہ میٹھا ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں قند ہے، اور پانی ہے۔ کڑوی کوئی چیز نہیں اور وہ شخص بھی معتبر ہے۔ اس نے کوئی اور چیز ملائی بھی نہیں ہے، لیکن زبان جو کہ ماؤف نہیں ہے، اس کے خلاف حکم کرتی ہے۔ تو اب فرمائیے! کس کا حکم معتبر ہوگا؟ ظاہر ہے کہ زبان ہی کا حکم معتبر ہوگا۔ اور دلائل و شواہد میں غور کیا جائے گا کہ اس میں کہاں غلطی ہوئی۔ اس شربت بنانے والے کے ہاتھ کڑوے تھے، یا پانی میں کوئی چیز کڑوی پڑ گئی تھی، یا جس دوکان سے وہ قند لایا گیا تھا وہاں کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ غرض دلائل و شواہد میں تاویل کی جائے گی یا ان کو غلط کہا جائے گا، لیکن زبان کے حکم کو غلط نہ کہا جائے گا۔

یہی حالت اصحابِ قلب کے قلب کے حکم کی ہوتی ہے کہ اوّل دھلے ہی میں جو حکم انہوں نے لگا دیا گو اس وقت دلیل نہ بیان کر سکیں، بلکہ بادی النظر میں دلیل اس کے خلاف بھی موجود ہو، لیکن حکم صحیح وہی ہوگا جو انہوں نے لگایا، اور تامل سے بعد میں دلیل بھی مل جائے گی۔ چنانچہ ان بزرگ کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا اور جہاد جیسی چیز کو دل نے قبول نہیں کیا۔ اور آخر میں اس میں نفس کا مکر ہی ثابت ہوا۔ شیطان کے اور نفس کے عجیب عجیب مکر و فریب ہیں۔ اور ان دونوں میں سے نفس کا مکر زیادہ بڑھا ہوا ہے، کیونکہ شیطان اوّل تو چلتا پھرتا رہتا ہے ممکن ہے کہ کسی وقت انسان کے پاس موجود نہ ہو اور اس وقت انسان اس سے بچا رہے۔ لیکن نفس تو ہر وقت انسان کے اندر ہی موجود ہے یہ ہر وقت کا مارِ آستین ہے۔ شیطان سے تو کسی وقت آدمی بچ بھی جائے لیکن اس سے بچنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے ہر وقت تیقظ کی اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس نے بڑے بڑوں کو دھوکے دیئے ہیں۔ پھر خود شیطان ہی کو کس نے غارت کیا؟ اسی نفس نے

جوکہ اس کا قرین ہے۔ شیطان کو سجدہ کا حکم ہوا لیکن اس کے نفس نے سوجھایا کہ بڑی ذلت ہوگی تو آتشی ہے، اور آدم خاکی، آگ کو خاک پر شرف حاصل ہے۔ آگ لطیف ہے اور خاک کثیف، آگ نورانی ہے اور خاک ظلمانی، لہٰذا یہ قلب موضوع ہے کہ تو آدم کو سجدہ کرے۔ چنانچہ اس نے سجدہ نہیں کیا اور غارت ہوا۔ تو نفس وہ چیز ہے جس نے شیطان کو بھی غارت کیا۔ نفس شیطان سے بھی زیادہ چالاک ہے، شیطان کو بھی دھوکہ دے دیتا ہے نفس کو وہ چالاکیاں آتی ہیں جن کا پتہ بھی نہیں چلتا، بڑے بڑوں کو اس نے ہلاک کیا ہے پھر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا دشمن جو چالاک بھی ہو کیسا خطرناک ہوگا۔ اسی لئے محققین نے نفس کو زیادہ دشمن سمجھا ہے اور اسی سے ہوشیار رہنے کی زیادہ تاکید کی ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

اے شہاں کشتیم ما خصم بروں! ماند خصمے زو بتر در اندروں

کشتن ایں کار عقل و ہوش نیست شیر باطن سخرہ خرگوش نیست

نفس کے بڑے بڑے گھات ہیں جن سے وہ انسان کو ہلاک کرتا ہے، بسا اوقات یہ معصیت پر ایسا رنگ چڑھاتا ہے کہ وہ طاعت معلوم ہونے لگتی ہے بھلا کیسے کوئی اس کے مکر سے بچے۔ نفس کے مکروں پر تنبیہ جبھی ہو سکتا ہے کہ قلب میں نورانیت ہو، اور ایسا صحیح حس حق و باطل کے پہچاننے کا پیدا ہو گیا ہو جیسے زبان میں ہے، کڑوا اور میٹھا مزہ پہچاننے کا۔ جب قلب ایسا ہو جائے گا تو اس کو قرآن میں وہ چیزیں ملیں گی جو بیان میں نہیں آسکتیں۔ اب بیان ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ نورانیت قلب اور توفیق خیر عطا فرمائیں۔

میں اس بیان کا نام "جلاءُ القلوب" تجویز کرتا ہوں کیونکہ اس میں دل کی صفائی ہی کا بیان ہوا ہے۔ اور ایک لقب بھی تجویز کرتا ہوں "جامِ جمشید" کیونکہ جام جمشید کے متعلق مشہور ہے کہ اس میں دنیا کی خبروں کا انعکاس ہوا کرتا تھا۔ اس میں دل کی صفائی کا بیان ہوا ہے اس سے دل ایسا ہو جائے گا کہ اس میں حق کا انعکاس ہونے لگے گا۔ اور اتفاقی بات ہے کہ ابھی ایک شعر زبان پر آیا تھا جس میں جام جم کا لفظ تھا۔ اس سے یہ لقب پیدا ہوا نیز اس لقب میں حافظ صاحب (نواب جمشید علی خاں صاحب میزبان و مالک مکان) کا نام بھی آگیا۔

کاتب وعظ احقر محمد مصطفےٰ بجنوری مقیم میرٹھ محلہ کرم علی عرض کرتا ہے کہ اس سفر میں تین وعظ ہوئے سب سے پہلا یہ وعظ مسمی جلاء القلوب ملقب بجام جمشید اور اس سے اگلے دن بمقام کاٹھ متصل باغپت وعظ رجاء العیوب لمقب بصبح امید اور اس سے اگلے دن بمقام میرٹھ وعظ دَوَاءُ الْعُیُوْبِ ملقب بہ شام خورشید۔ تینوں کے نام مقفا ہیں نیز القاب بھی اور تینوں کی وجہ تسمیہ نہایت معقول ہے۔ جلاء القلوب کی وجہ تسمیہ اور لقب کی مناسبت تو ابھی بیان ہوئی۔ اور کاٹھ میں وعظ مستورات کے مجمع میں تحت آیت ان الذین یتلون کتاب اللہ واقاموا الصلوٰۃ وانفقوا مما رزقناھم سرا وعلانیۃ یرجون تجارۃ لن تبور ہوا تھا۔ جس میں ربا کا مضمون غالب تھا اور خود آیت ہی میں یَرْجُوْنَ کا لفظ موجود ہے نیز آیت میں جو وعدے ہیں وہ آخرت کے ہیں جو عالم غیب ہے اس واسطے رجاء العیوب کیا ہی برمحل نام ہوا نیز وعظ کا وقت صبح کا تھا اس وجہ سے صبح امید کیا ہی چسپاں لقب رہا اور میرٹھ میں وعظ تحت آیت وَجَآءَکُمُ النَّذِیْرُ۔ ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ نذیر کی تفسیر بعض علماء نے بڑھاپے سے کی ہے لہٰذا بوڑھوں کو زیادہ ضرورت اپنی اصلاح کی ہے اور اس میں امراض اور ان کے علاج مذکور ہوئے لہٰذا دواء العیوب اسم بامسمی ہوا اور اتفاق سے یہ وعظ شام کے وقت ہوا تھا جس وقت آفتاب کا غروب قریب تھا

اور بڑھاپا عمر کی شام ہے لہٰذا شام خورشید لقب نہایت مناسب رہا۔ اور اس میں ایک لطیفہ یہ بھی ہوا جس کی طرف حضرت والا کو بھی خیال نہیں تھا کہ جب لقب شام خورشید تجویز ہوا تو احقر نے عرض کیا کہ خورشید علی خاں جمشید علی خاں صاحب کے والد ماجد مرحوم کا نام تھا تو اس سلسلہ میں دونوں نام آگئے تو حضرت والا نے مسرت ظاہر فرمائی۔ چونکہ یہ سفر بفرمائش نواب صاحب موصوف ہوا تھا اس واسطے بقاعدہ ملا کر اکثر حکم الکل تین وعظوں میں سے دو میں اس خاندان کے نام آجانا گویا کل میں آجاتا ہے یہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ معذرت بعد ختم وعظ شام خورشید حضرت والا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ کاش یہ تینوں وعظ ایک ساتھ ہی چھپیں۔ لیکن بعض موانع قویہ کی وجہ سے یہ نہ ہو سکا وہ دونوں وعظ یعنی صبح امید اور شام خورشید تیار ہو کر عرصہ ہوا کہ شائع ہو چکے اور یہ وعظ مسمیٰ بہ جام جمشید سب سے آخیر میں تیار ہوا۔ افسوس ہے کہ حضرت والا کی خواہش پوری نہ ہو سکی تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ اہل مطابع تینوں وعظوں کو اب یکجا کر دیں۔ فالحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات ناظرین سب سے پہلے حضرت واعظ صاحب مدظلہ کی درازی عمر و صحت وقوت وبقاء فیوض کے لئے دعا کریں اس کے بعد کاتبین وعظ کے لئے اور سب سے اخیر میں احقر کے لئے اور احقر کے والدین کے لئے دعا کریں۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

تتمہ وعظ ہٰذا از صاحب وعظ: وعظ ہٰذا کے ختم کے قریب جہاں سے او القی السمع وھو شہید کا بیان شروع ہوا ہے اس سے تقریباً صفحہ ڈیڑھ صفحہ بعد جس جگہ لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ اور القی السَّمْعَ کے تقابل کی بحث ہے وہاں خطوط وحدانیہ کے درمیان ایک چھوٹی سی عربی عبارت ہے اس میں یہ جملہ ہے ولہٰذا التقابل وجوہ الاخری محتملۃ ان وجوہ میں سے میں نے جس وجہ کو بیان القرآن میں اختیار کیا ہے تمام فائدہ کے لئے

اس کو یہاں مختصراً نقل کر دینا مناسب اور مفید سمجھتا ہوں وھو ہذا اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو یا اگر فہم زیادہ نہ ہو تو کم از کم یہی ہو کہ) وہ (دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو (اور حق کو اجمالاً حقانیت کا معتقد ہو کر تبعاً لاہل الفہم اس بات کو قبول کر لیتا ہو الخ) آہ توضیح مزید وجدید ومفید پہلی شان محقق کی ہے اور دوسری مقلد کی یعنی تذکر کے لئے یہ شرط ہے کہ مخاطب محقق ہو یا مقلد۔ فقط

اشرف علی

نوٹ: بحمدللہ وعظ جام جمشید ختم ہوا۔ اب آگے ملفوظات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مدیر